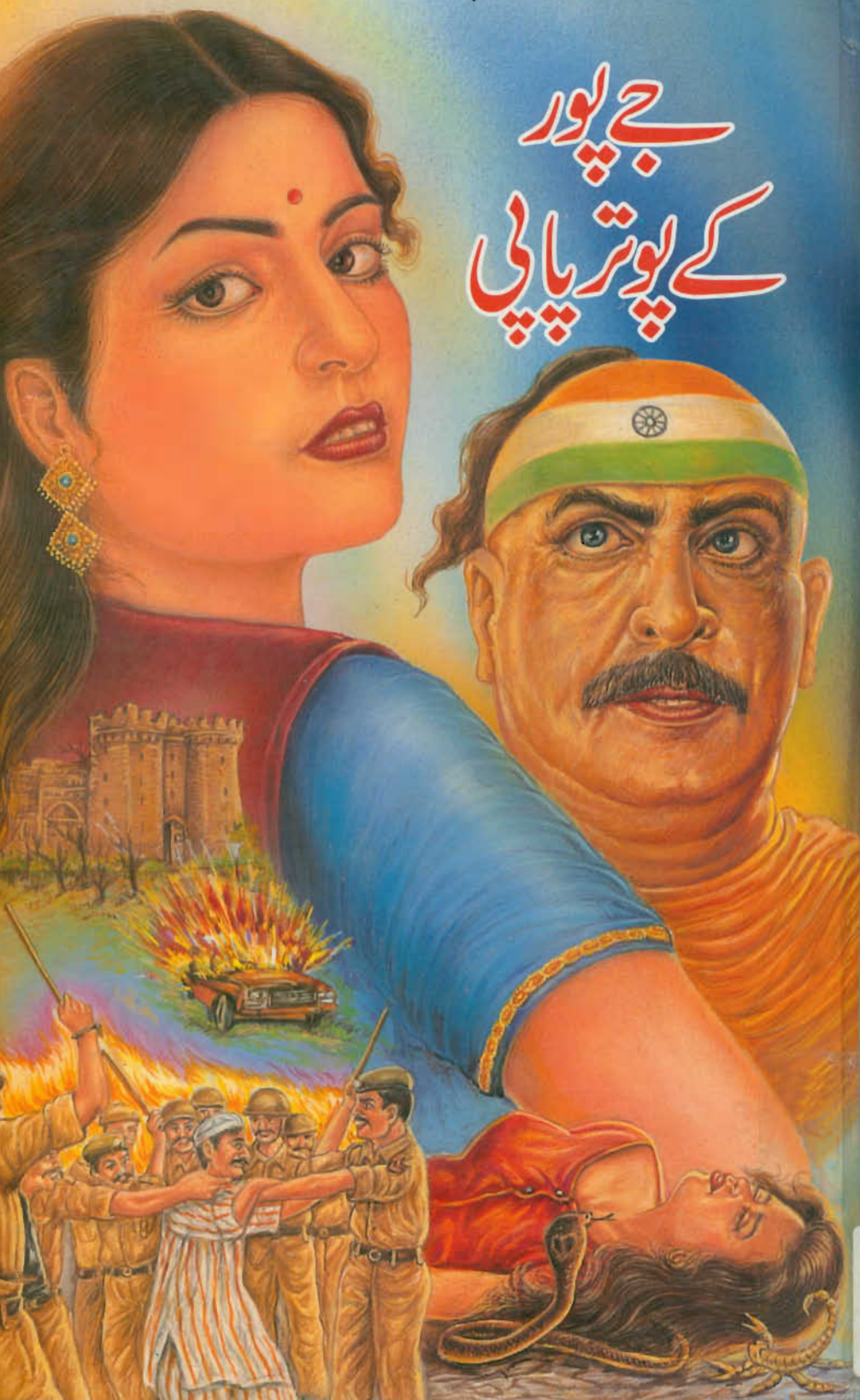


جے پور کے پوتریانی



ایک مجاہد کی جذبہ اسلام سے سرشار جرأت آموز نچی داستان

جے پور کے پو تر پاپی

ابو جواد

— تاشر —
علی میاں پبلی کیشنز

۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۱۴

چند ماہ قبل میں اپنے آفس میں بیٹھا بعض ضروری کاغذات کے مطالعے میں مصروف تھا۔ سہ پہر کے تین ساڑھے تین بجے ہوں گے۔ دفتر میں دو بجے چھٹی ہو چکی تھی اور زیادہ تر شاف جا چکا تھا۔ مگر میں اپنے ذمے معاملات کو اسی روز نپٹانے کا تہیہ کیے ابھی تک کام میں مصروف تھا۔ اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دوپہر کے وقت پتو کی سے میرے بڑے بھائی حاجی شوکت علی تشریف لے آئے تھے۔ کچھ دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی رخصت ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں حسب معمول کام میں مصروف ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ تھا اور باہر شدید گرمی تھی۔ میری خواہش تھی کہ دھوپ کی حدت کچھ کم ہو تو گھر کے لیے نکلوں، تب تک کچھ کام بھی نپٹ جائے گا۔

اسی دوران باہر سے ہلکی سی دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھول کر ایک صاحب اندر داخل ہو گئے۔ درمیانی قد و قامت کا وہ شخص پچاس پچپن کے پینے میں تھا۔ چہرے پر موجود سفید داڑھی نے اس کی شخصیت کو خاصا وقار بنا دیا تھا۔ میں اس کے احترام میں اپنی نشست سے ہلکا سا اٹھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ شخص میرا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے کھڑے کھڑے کچھ دیر مجھے بغور دیکھتا رہا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے وہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

اس کے رویے سے میں کسی قدر حیران سا تھا اور اسے پہچاننے کی پوری کوشش کر رہا تھا، مگر کوشش کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ میں ان صاحب سے کہاں مل چکا ہوں؟ وہ

جے پور کے پوتر پانی ☆ 6

خاموشی سے بیٹھا غالباً میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ صورت حال کچھ دیر قائم رہی۔

تبھی میں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے گویا اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ”جناب! میں کوشش کے باوجود آپ کو پہچان نہیں سکا۔ ویسے لگتا ہے ہم پہلے بھی کیس مل چکے ہیں۔“ وہ شخص ایک باوقار مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ ”یار! تم نے تو یہ بات بالکل صحیح ثابت کر دی کہ جیل اور ریل کی یاری انتہائی ناپائیدار ہوتی ہے۔“ اس کے منہ سے یہ سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ کی آواز کافی جانی پہچانی لگ رہی ہے، مگر میں.....“

وہ میری بات اچکتے ہوئے بولا۔ ”چھوڑو یار! تمہاری تحریروں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت غیر معمولی ہے لیکن اب پتہ چلا کہ حافظے کے معاملے میں بالکل پیدل ہو۔“

اس کی حد سے بڑھتی ہوئی بے تکلفی مجھے خاصی ناگوار گزری تھی مگر اس کے پُر اعتماد لب و لہجے نے مجھے کسی ردِ عمل کے اظہار سے روک رکھا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا اور پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے تم ”الور“ جیل کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہو۔ شاید اسی لیے اب تک تمہاری کسی تحریر میں اس کا تذکرہ نہیں آیا۔“

یہ الفاظ سنتے ہی میرے ذہن پر چھائی ساری دھند یکبارگی چھٹ گئی تھی۔ ”آپ غالباً مراد صاحب ہیں؟“ اس پر وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ”غالباً نہیں مسٹر ابو جواد! میں یقیناً مراد ہی ہوں۔ وہی مراد تاش کھیتے ہوئے آپ جس کے پارنمر ہوا کرتے تھے۔“

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کا چکر کاٹ کر اسے جا پلندا۔ وہ بھی انتہائی گرجبوش سے گلے ملا تھا۔

کتنی ہی دیر ہم دونوں کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا تھا، البتہ دونوں کی

جے پور کے پوتر پانی ☆ 7

آنکھوں کے گوشے ہلکے سے بھیک گئے تھے۔ شاید انتہائی غم کی طرح دفور مسرت سے بھی دل پگھل کر آنکھوں میں تیرنے لگتا ہے۔

اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کے بعد بھی ہم دونوں کتنی ہی دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے ہی خاموشی کا یہ دورانیہ ختم کیا۔ ”مراد صاحب! آپ کا تو حلیہ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ارے حضرت! خود پر بھی تو نظر ڈالئے! اس معاملے میں آپ بھی زیادہ پیچھے نہیں رہے۔“

میں نے چوکیدار کو بلا کر کچھ کھانے پینے کے لیے منگوایا۔ اس کے بعد بات چیت کے دوران ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب سائے ڈھلے اور شب کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ میں نے مراد سے پوچھا تھا۔ ”آپ کو میرا ایڈریس کہاں سے مل گیا جو ڈھونڈتے ہوئے سیدھے یہاں تک پہنچ گئے؟“

وہ اپنی انگلیاں چٹاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ڈھونڈنے نکل پڑو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اس کا طویل جواب مکمل ہونے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”یہ ابھی آپ نے بوسنیا کا ذکر کیا تھا مراد بھائی! وہاں کیا کر رہے ہیں اور آپ نے راحت بھائی کے متعلق کچھ نہیں بتایا کہ وہ کس حال میں ہیں؟“ یہ سنتے ہی جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”ارے بھئی! یہ افسانے نہ بنی پھیرو تو بہتر ہے۔ باقی رہا تمہاری راحت بھائی کا معاملہ تو برخوردار! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ”راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔“

میں اس کی جانب قدرے متحیر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ”مراد بھائی! یہ آپ ہی بول رہے ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ آپ تو عشق ہی کو مقصدِ حیات قرار دیا کرتے تھے مگر آج کیسی ہلکی باتیں کر رہے ہیں۔“

وہ جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ چوکیدار کمرے میں داخل ہوا۔ ”سر! رات کے آٹھ بج چکے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو کینٹین سے رات کا کھانا لے آؤں؟“ وہ غالباً ہمیں یہ

احساس دلاتا چاہتا تھا کہ ہمارا دفتر سے اٹھنے کا ارادہ بھی ہے یا رات یہیں بسر کرنے کا سوز ہے۔

کچھ دیر بعد ہم دفتر سے نکل رہے تھے۔ ”چلیں مراد بھائی! گھر چلتے ہیں۔ وہیں مزید باتیں ہوں گی۔“ وہ بولا۔ ”نہیں یا! گھر ضرور چلیں گے مگر آج نہیں۔ ابھی تو تم میرے ساتھ ہوٹل چلو جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یا پھر ایسا کرتے ہیں یہیں سہرے کے کنارے کسی جگہ بیٹھ کر ایک دوسرے کی رات کمانی سنتے ہیں۔“

ہم نے یونیورسٹی مین کیفے سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کچھ دوری پر سہرے کے کنارے جا بیٹھے۔ وہ مجھ سے میرے بیوی بچوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ سچ میں جب بھی میں نے اس کی بیوی راحت کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے لگا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار نہیں۔

اس کا رویہ دیکھ کر میرے اندر تجسس بڑھتا گیا۔ جب میں نے تیسری چوتھی بار وہی بات چھیڑی تو وہ سپاٹ سی آواز میں بولا۔ ”چھوڑو یا! راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو اب کیوں ہوا دیتے ہو۔ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو جائیں گے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں اور پھنسی ہوئی امیدوں کے تذکرے سے کچھ بھی حاصل ہوا ہے؟“

میں کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب؟ کیا خدا نخواستہ راحت بھائی دنیا میں نہیں رہیں؟“ وہ جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”خدا نہ کرے ایسا ہو۔ وہ حیات ہے اور غالباً ٹھیک ہی ہو گی۔“ اس کے جواب نے میرے اندر عجیب سی سنسنی پیدا کر دی تھی۔

میرے مزید اصرار پر اس نے ساری تفصیل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بیان کر دی۔ رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی جب ہم وہاں سے اٹھے۔ وہ اگلے روز لٹنے کا وعدہ کر کے ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا اور میں نے گھر کی راہ لی۔

بستر پر لیٹنے کے بعد نیند کو سوس دور تھی۔ ذہنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ متضاد

خیالات نے ذہن میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یادوں کی اس بارات میں نیند بھلا کیسے آتی ہے۔ میرا طائر خیال مجھے انیس برس پیچھے لے گیا جب مراد سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

☆=====☆=====☆

۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو مجھے سینٹرل کورٹ سے پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے ”بے بنیاد“ الزام کے تحت طویل قید با مشقت کا حکم سنایا جا چکا تھا جس کے بعد میں فرار ہونے کی کوشش کے بعد بھوت پور کے قریب دوبارہ گرفتار ہو چکا تھا اور کئی تکلیف دہ مراحل اور وادی تفتیش کی بھول بھلیوں سے گزرنے کے بعد جے پور جیل میں تھا۔

اس دوران بھارت میں ایمر جنسی نافذ کی جا چکی تھی اور تمام تر بھارتی اپوزیشن کی صف اول کی قیادت سمیت لاکھوں کارکن گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس وجہ سے تمام جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدی بند تھے اور جیل کونت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اس مشکل صورت حال سے غصے کے لیے بھارت سرکار نے اصولی طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ بھارت کے طول و عرض میں مختلف الزامات کے تحت گرفتار پاکستانیوں کو کسی ایک جیل میں اکٹھا کر دیا جائے تاکہ ان سے متعلقہ انتظامی مسائل بستر ڈھنگ سے بنائے جاسکیں۔

اس حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اس مقصد کے لیے قریب نال اور جیل کے نام پڑا اور سبھی پاکستانیوں کو وہاں ٹرانسفر کرنے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔

دہلی سرکار کے اس نادر شاہی حکم کی سرکاری کی مجال بھلا کسے ہوتی، لہذا ایک ماہ کے اندر ہی چار سو کے لگ بھگ پاکستانی شہریوں کو اور منتقل کر دیا گیا۔ مجھے بھی جولائی کی تیرہ تاریخ کو الور روانہ کر دیا گیا۔ میرے ساتھ بھلوال سرگودھا کے میان محمد خان بہاولنگر کے گاؤں ”کھائوں“ کے انور ماچھی اور نورث عباس کے اللہ یار بھٹی کے لیے بھی یہی حکم دیا

گیا تھا۔

ہم چاروں اس فیصلے سے خاصے خوش تھے کہ سبھی ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا موقع ملے گا اور اس طرح شاید اسیری کی تلیوں میں کسی حد تک کمی واقع ہو سکے۔ اور 'راجستھان' کے شمال مشرق میں آخری ضلع ہے۔ جس کے بعد صوبہ ہریانہ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے آگے دہلی ہے۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر چھوٹی پٹائیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کا موسم گرمیوں میں خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔

شہر سے قریب دو میل کے فاصلے پر الور جیل واقع ہے۔ یہ علاقہ دیران سا ہے۔ جیل دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دیوار کی جانب پرانی جیل کی عمارت تھی جس میں آٹھ چھوٹی بیرکیں تھیں۔ فصیل کے دوسری طرف کچھ سال پہلے جیل کی نئی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں بھی آٹھ بیرکیں اور دو احاطے تھے۔ بیرک نمبر ۱۵ تا ۱۸ ایک احاطے میں جبکہ ۱۹ تا ۲۲ دوسرے میں تھیں۔

نئی اور پرانی جیل کے درمیان ۲۰ فٹ بلند اور چار فٹ چوڑی دیوار تھی۔ ایک کالے رنگ کا بڑا سا آہنی پھانک دونوں جیلوں کو ملا تھا۔ جیل کے مرکزی گیٹ کے باہر چار چھوٹی بیرکوں پر مشتمل الگ حصہ تھا جسے کبھی زنانہ جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا مگر اب اسے کال کوٹھڑیوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ عام طور پر جیل کے اندر ہی کال کوٹھڑیاں ہوتی ہیں مگر الور جیل اس لحاظ سے ذرا منفرد نوعیت کی حامل تھی۔

ہم چاروں سہ پہر چار بجے مسلح گارڈ کی معیت میں جیل ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ضروری اندراج کے بعد سپرنٹنڈنٹ کا حکم ہوا کہ فی الحال انہیں بیرونی زنانہ خانے میں رکھا جائے۔ ظاہر ہے ہمیں یہ سن کر قطعی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ہم تو اس اسید پر یہاں آئے تھے کہ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے....." مگر وہاں ہماری خوشی یا نا خوشی کی بھلا کیسے پردا تھی۔ بیڑیوں سمیت فوراً ہی کال کوٹھڑیوں میں پہنچا دیئے گئے، البتہ وہاں ہمیں صرف دو راتیں گزارنا پڑیں۔

اگلے ہی روز ڈیوٹی حوالدار شہجو دیال نے ہمیں آکر خوشخبری سنائی کہ تم چاروں کو پاکستانی وارڈز میں بھیجے گا یا آدرش (حکم) آگیا ہے۔ ہم نے فوراً ہی اپنا بوریا بستر (جو ایک عدد درزی اور کپڑے پر مشتمل تھا) سمیٹا اور حوالدار موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی راہنمائی میں جیل ڈیوڑھی کی جانب چل پڑے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے چیف ہیڈ وارڈن کے دفتر پہنچائے گئے۔

ہم چاروں پاکستانی حصے میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے دل کی سبھی مرادیں بر آئی ہوں۔ جب ہم چاروں پاکستانی حصے میں داخل ہوئے تو سبھی لوگوں نے بڑی گرجوٹی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں یوں مل رہے تھے جیسے ہم بڑی اہم شخصیات ہوں۔ اس غیر معمولی احترام کی فوری وجہ تو ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ ہمیں اپنے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہ تھی بلکہ "من آئم کہ من رانم" والا معاملہ تھا لیکن بھلا عزت کے اچھی نہیں لگتی، لہذا ہم چاروں بھی وقتی طور پر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے اور اپنی تمام تکلیف بھلا بیٹھے تھے۔

ہم چاروں کو ۱۵ نمبر بیرک میں جا کر ٹھہرایا گیا۔ وہاں موجود آکری شخصیت کے مالک ایک صاحب نے اپنے ساتھی کو ہمارے لیے چائے بنانے کا کہا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ شخص یہاں خاصی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

میاں محمد خان نے اس کی طرف استغماہ نگاہیں اٹھائیں تو ان کا بدعابھانپ کر وہ جوان عمر شخص گویا ہوا۔ "میرا نام سید توسل حسن ہے اور میں پاکستانی پنجاب کے ضلع ریت سے تعلق رکھتا ہوں۔"

اس شخص کا لہجہ انتہائی شائستہ تھا۔ مزید بات چیت سے اندازہ ہوا کہ موصوف کو گفتگو کا حلقہ آتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے بھارت اپنے عزیزوں سے ملنے آیا تھا اور اس جرم کی پاداش میں ایک سال کی سزا بھگت چکا ہے اور اب "ڈیفنس آف انڈیا رڈرز" کے تحت نظر بند ہے۔ میاں محمد اس کو بغور دیکھتے ہوئے

من اردو ڈاٹ کام

بے پور کے پوتر پالہ ☆ 12

بولاً۔ ”سزا ختم ہونے کے بعد بھی آپ کو وطن کیوں نہیں بھجوا دیا گیا؟“

توسل شاہ اپنے مخصوص اور سنجیدہ انداز میں بولاً۔ ”محمد خان جی! میں ہی نہیں یہاں موجود تین سو سے زائد افراد اپنی سزائیں کاٹ چکے ہیں۔ ان میں پچاس سے زائد عورتیں اور بچے بھی ہیں اور سبھی دہلی سرکار کے نادر شاہی حکم کے تحت نظر بند ہیں۔ سرکار کا کہنا ہے کہ مناسب وقت پر ہمیں پاکستان بھجوا دیا جائے گا۔“ مزید استفسار پر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں اصل پاکستانی تو ساٹھ ستر سے زائد نہیں باقی سبھی خواتین و حضرات بنگلہ دیشی یا بھارتی ہیں جو پاکستان جاتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ بھارتی پولیس نے اپنے کاغذات میں انہیں پاکستانی شہری قرار دے کر جیل بھجوا رکھا ہے۔

یہ بات ہمارے لیے یقیناً اچھے سے باعث بنی تھی۔ میں دھیرے سے بولاً۔ ”مگر شاہ صاحب! یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو زبردستی پاکستانی قرار دینا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے ضمن میں نہیں آتا؟“ توسل شاہ نے میری جانب یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ ”جناب! آپ کون سے انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ بھارتی حکام کی نظر میں دنیا کا ہر مسلمان عموماً اور بھارتی مسلمان خصوصاً پاکستانی ہے۔ اس کا بس پلے تو سبھی بھارتی مسلمانوں پر پاکستانی کا ٹیبل لگا کر یا تو انہیں ختم کر دیں یا دیس سے نکال دیں۔“

کچھ توقف کے بعد توسل شاہ بولاً۔ ”آپ چاروں کے کال کو فہرزی بھجوائے جانے کی خبر ہمیں مل گئی تھی جس پر ہم سبھی نے بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ اس کے نتیجے میں حکام نے آپ چاروں کو بیرک میں بھجوا دیا ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جلدی سے بولاً۔ ”یار میں نے شکریہ وصول کرنے کے لیے تمہیں یہ بات نہیں بتائی۔ بھلا اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ یہاں دشمن دیس میں بھی اگر ہم لوگ ایک دوسرے کی بھلائی نہیں سوچیں گے تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔ اپنے ملک میں رہتے ہوئے تو ہمیں ایک دوسرے کی ٹانگ

بے پور کے پوتر پالہ ☆ 13

کھینچنے سے بھی فرصت نہیں ملتی۔ پھر آپ چاروں تو ہم سب کے لیے اس لئے بھی محترم ہیں کہ ہم سبھی اسگٹنگ یا دیگر ذاتی مفادات کے حصول کے لیے بھارت میں داخل ہوئے تھے جبکہ آپ چاروں قوم کے اجتماعی مفاد میں یہ مصائب جھیل رہے ہیں۔“

بات کچھ طول پکڑ گئی تھی ’لہذا اللہ یار بھی اپنے مخصوص اکثریت میں بولاً۔ ”شاہ جی! اس ذاتی اور اجتماعی مفاد میں جو بڑی معمولی سی حد فاضل ہوتی ہے اس پر کسی وقت بات کر لیں گے‘ لیٰ الحال تو آپ ہمارے پیٹ کے مفاد کی بابت سوچیں۔“

نوجوان توسل شاہ خوشدلی سے ہنستے ہوئے بولاً۔ ”واقعی آپ لوگوں کو بھوک لگی ہو گی۔“ وہ دیس بیٹھے ہوئے بلند آواز میں بولاً۔ ”ارے بھی شیر مٹھا جلدی کرو تم چائے پکا رہے ہو یا پائے؟“

چند روز وہاں رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ توسل شاہ کو وہاں موجود پاکستانی قیدیوں کے مسئلہ رہنمائی حیثیت حاصل ہے اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ چند ہی روز بعد وہاں کی خوشگوار فضا میں ہم نوگ قیدی کی تلخیاں بڑی حد تک بھلا بیٹھے تھے۔ اپنوں کے درمیان جیل بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ہی پاکستانی نظر بند خاصی مراعات حاصل کر چکے تھے۔ اگرچہ یہ مراعات انہیں کسی نے پیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کی تھیں بلکہ سبھی نے اپنے مثالی اتحاد و اتفاق اور توسل شاہ کی فعال قیادت میں یہ سب کچھ حاصل کیا تھا۔

وہاں جمع ہونے کے کچھ روز بعد ہی ریڈیو مین طرز کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ توسل شاہ کی تجویز پر آٹھ آدمیوں پر مشتمل مجلس عالمہ تشکیل دی گئی۔ ہر بیرک کا ایک نمائندہ عالمہ کارکن تھا جبکہ توسل شاہ اور ظفر اقبال بالترتیب غیر اعلانیہ طور پر صدر اور نائب صدر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

شروع میں جیل حکام سے دالی بال کھیلنے کی اجازت اور سامان حاصل کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر بیرک میں ایک پہلی فائرنگ کر ریڈیو سننے کی اجازت بھی مل گئی۔ تمام پاکستانی

فن اردو ڈاٹ کام

قیدیوں نے کسی قسم کی مشقت کرنے سے بھی انکار کر دیا جسے مجبوراً جیل حکام کو تسلیم کرنا پڑا کیونکہ آئے دن کی بھوک ہڑتالوں سے ان پر خاصا دباؤ پڑتا تھا۔

چند روز بعد پاکستانی مجلسِ عالمہ نے ہندوؤں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ بات حکام کو سخت ناگوار گزری تھی مگر کسی فوری ہنگامے سے بچنے کی خاطر یہ مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا اور خشک راشن فراہم ہونے لگا جیسے خورد پاکستانی پکاتے تھے۔ جیل کے لحاظ سے یہ سہولتیں مثالی تھیں۔ بھارتی حکام ان سب معاملات کو بڑی تشویش سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب اپنے اس فیصلے پر اکثر تاسف کا اظہار کرتے کہ تمام پاکستانیوں کو ایک جگہ کیوں جمع کیا گیا مگر فی الحال کسی مصلحت کی بنا پر خاموش تھے۔

اگلے اتوار کو دوپہر کے وقت والی بال گراؤنڈ میں دریاں اور کھل بچھا کر ہم چاروں کے اعزاز میں ”بڑے کھانے“ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے میں ماش کی ترکے والی دان اور آلو کی بھیجا شامل تھی۔ سوائے خواتین کے سب پاکستانی مرد اور بچے اس دعوتِ شیراز میں شامل ہوئے۔ کھانے کی لذت اپنوں کی چاہت کی بدولت دوبالا ہو گئی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر ظہر کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔ اس کے بعد خوش گپیوں اور باہمی تعارف کا سلسلہ شروع کیا۔

ظفر اقبال نے بھی کا تعارف کرایا جس میں پاکستان میں ان کی جائے رہائش اور بھارت میں پکڑے جانے کی مختصر روداد شامل تھی۔ یہ مرحلہ انتہائی دلچسپ تھا۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر کبھی ایک شخص کے پاس جاتا اور کبھی دوسرے کے۔ یہ ملک رمضان ہیں، منڈی یزمان کے رہنے والے۔ ان کے قبضے سے بوقت گرفتاری ۱۵ کلو چرس برآمد ہوئی تھی۔ یہ بٹ صاحب ہیں لاہور کے رہائشی، یہ دس کلو گینے سمیت پکڑے گئے تھے اور یہ سلطان خان آف پشاور ہیں جو پانچ من گینے اور چار بستوں سمیت پکڑے گئے تھے۔

الزام بتنا بڑا ہوتا مذکورہ شخص اتنا زیادہ سینہ پھلا کر بات کرتا۔ اس چکر میں خاصا وقت گزر گیا تو میں نے کہا۔ ”یار ظفر صاحب! اب چلو چل کر بیٹھتے ہیں۔ تعارف کی اگلی

قسط پھر کبھی سنی۔“ مگر ظفر اقبال میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ درخت سے ٹیک لگائے جو صاحب آنکھیں سوندے بیٹھے ہیں، وہ حاصل پور کے بشیر احمد ہیں۔ اچھے بھلے زمیندارہ کرتے تھے کہ دماغ میں حالی مستان بننے کی ٹھان لی۔ اپنے بھی موٹی بیج کر چرس خریدی اور بھارت تشریف لے آئے تاکہ ایک ہی بار میں وارے نیارے ہو جائیں گے مگر پہلے ہی پھیرے میں دھریے گئے اور اب اکثر دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں کہ بھی پہلا پھیرا لگنے بھارت کا رخ نہ کریں۔“

تعارف کا یہ سلسلہ اتنا دلچسپ اور پُر مغز تھا کہ وقتی طور پر زہنی تناؤ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے ظفر بولا۔ ”گری کے موسم میں کھل اوزھ کر لینے ہوئے حضرت رب نواز ہیں، فورت عباس کے سرحدی گاؤں کے رہنے والے۔ اچھا بھلا کھاتا پیتا ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے مگر سنگتی نے اسے اس حال کو پہنچا دیا۔“

میں نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ ”سنگتی نے اس حال کو پہنچا دیا؟ میں سمجھا نہیں۔“ ظفر صاحب تفصیلات فراہم کرنے لگے۔ ”رب نواز کی سنگتی قربی گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے طے تھی۔ ان کے علاقے کا المیہ یہ ہے کہ جس نوجوان نے ایک بار بھی بھارتی سرحد غیر قانونی طور پر عبور نہ کی ہو اسے اکثر لوگ بزدل خیال کرتے ہیں۔ رب نواز نے کبھی یہ غیر قانونی حرکت نہیں کی تھی کیونکہ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں تھا، لہذا اسے کبھی سنگٹ یا چوری کے لیے بھارت جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔“

مجھے اب ظفر اقبال کی باتوں میں کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، لہذا پورے انشاک سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ وہ اپنی جیب سے بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔ ”سنگتی کے بعد رب نواز بہت ہی خوش تھا کیونکہ اس کے والدین نے اس کی پسند کے مطابق رشتہ طے کر دیا تھا، حالانکہ لڑکی قدرے غریب تھی مگر شکل و صورت کی کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ کچھ عرصہ بعد رب نواز کے جگری دوست رفیق نے اسے بتایا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ رب نواز کی سنگتیرانی اپنی سیلیوں کے سامنے سخت شرمندہ رہتی ہے

جے پور کے پوتر پائی ☆ 17

ڈھائی سال قید باسقت کی سزا بھگت رہے ہیں اور سامنے کبل اوڑھے لیٹے ہیں۔ ”میر خوار کوئی پوچھتا نہیں..... اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی“ کی عملی تصویر بنے ہوئے ہیں۔“

ظفر کی بات سن کر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رب نواز کی حالت زار پر اظہارِ افسوس کروں یا اس کی حماقت پر.....

ظفر نے چند لمحوں تک ہم چاروں کے چروں کا جائزہ لینے کے بعد شگفتہ انداز میں کہا۔ ”اس کے بعد پتہ ہے کیا ہوا؟“

میاں محمد خاں کچھ چڑ کر بولا۔ ”یار! اب اس قصے کو ختم بھی کرو۔ اس کے بعد بھلا کیا ہوتا تھا!“

ظفر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”جناب یہی تو آپ کو معلوم نہیں کہ اس کہانی کا کتنا منکس کیا تھا۔“

ہم چاروں اس کی جانب کچھ کسمے بغیر استغماہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ وہ اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”رب نواز کی گرفتاری کے چند ماہ بعد ان کے قریبی گاؤں کا ایک شخص بھارت میں پکڑا گیا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ رب نواز کی گرفتاری کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد اس کے ”جگری دوست“ رفیق اور اس کی سنگیتر رانی کی شادی ہو گئی تھی۔ دراصل ان دونوں نے اپنی ملی بھگت سے رب نواز کو بھارت جانے پر اکسایا تھا اور جب یہ واپس نہ آیا تو اسے بھارت جا کر اپنی مرداگلی کا ثبوت فراہم کرنے والے مرد دانہ نے اس کی عدم موجودگی میں خود اس کی سنگیتر سے شادی رچال اور اب رب نواز اکثر و بیشتر ”نالے دن گئی نالے کن پائے“ کا درد کرتا رہتا ہے۔“

اس قصے نے یقیناً ہم سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تبھی میوزن نے عصر کی اذان دی اور تبھی نے نماز ادا کی۔ شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور کچھ دیر بعد سب کو اپنی اپنی بیروں میں بند کر دیا گیا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے اچانک آسمان بادلوں سے ڈھک

کیونکہ اس کی بے تکلف سلیاں اسے اکثر طعنہ دیتی ہیں کہ اس کا سنگیتر رب نواز تو بالکل نامرد ہے جس نے ایک بار بھی سرحد پار نہیں کی۔ اس بات پر کچھ روز تو رب نواز نے کان نہ دھرے مگر جب رفیق نے تواتر کے ساتھ اس بات کی تکرار شروع کر دی کہ سنا ہے رانی بہت پریشان رہتی ہے کہ مجھے ایسے کم ہمت کے پلے کیوں باندھا جا رہا ہے تو رب نواز کی مردانگی بھی تھوڑی جوش میں آئی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے اوپر لگا بزدلی کا داغ مٹانے کے رہے گا اور بھارت جا کر کسی اچھی نسل کا گھوڑا یا اونٹ خرید کر یا ہوسکا تو چرا کر لائے گا اور پھر اسی پر بیٹھ کر اپنی رانی کو بیاہنے جائے گا۔

”رفیق نے اپنی باتوں سے اس کے بلند عزائم کو مزید تقویت پہنچائی“ لہذا شادی سے بیس روز قبل رب نواز نے تقریباً ایک سن بادام کے مغز اٹھائے (واضح رہے کہ بادام سمگل ہو کر پاکستان سے بھارت جاتا تھا) اور رات کی تاریکی میں پاک بھارت سرحد عبور کر کے اپنے ”مردانہ مشن“ پر روانہ ہو گیا۔ رفیق نے سرحد تک ساتھ جا کر اسے نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کیا تھا اور اسے چند بھارتی اسمگلروں کے پتے بھی دیئے تھے تاکہ وہ ان کے ہاتھ بادام فروخت کر کے واپسی پر گھوڑا لایسکے۔ اگرچہ رب نواز کا بخت ارادہ تھا کہ وہ باداموں سے حاصل ہونے والی رقم کے عوض اپنی رانی کے لیے چند قیمتی جوڑے لائے گا تاکہ اس کی مکمل مردانگی کا سکہ ہمیشہ کے لیے زانی پر ثبت ہو جائے۔“

ظفر اقبال کہانی سناتے ہوئے چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ غالباً ہمارے چروں سے اندازہ لگاتا چاہتا تھا کہ ہم اس کی باتوں میں کس قدر دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اس داستان میں واقعی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ لہذا میں نے ہلکے سے ظفر کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آگے بھی بتاؤ پھر کیا ہوا؟“ ظفر دھیمی آواز میں بولا۔ ”پھر کیا ہوتا تھا“ جیسے ہی رب نواز بادام لے کر رفیق کے بتائے ہوئے اسمگلر رتن لعل کے پاس پہنچا اس نے بظاہر اس کی خاصگی آد بھگت کی اور اندر بیٹھک میں بٹھا کر اسے کھانا وغیرہ دیا۔ اسی دردن اس نے پولیس بلوائی اور رب نواز کھانا کھاتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے اور اب

گیا۔ گرمی کی شدت سے لوگوں کا برا حال تھا۔ اگرچہ پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب گرمی بہت شدید نہیں پڑتی تھی مگر اس برس خلاف معمول نسبتاً زیادہ گرمی پڑی تھی۔ بادلوں کی آمد اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ہر شخص بڑی فرحت محسوس کر رہا تھا۔

بادل خاصی دیر گھن گرج کے جو ہر دکھاتے رہے۔ ہر شخص بارش کی دعا کر رہا تھا مگر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا گرہنے والے برستے نہیں لہذا ہوا کچھ دیر بعد ان بادلوں کو اڑا لے جائے گی مگر کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ گرہنے والے کبھی کبھار برس بھی پڑتے ہیں اور جب برسے لگیں تو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بارش نے چاروں طرف جل تھل کر دیا تھا۔ بیرک کے چاروں طرف دیواروں میں لوسے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں جن سے آدمی تو باہر نہیں جاسکتا تھا مگر بارش کی تیز بوچھاڑ ضرور اندر آتی تھی اور آج بھی تین اطراف سے آ رہی تھی لہذا کبھی لوگ چوتھے محفوظ کونے میں سمت گئے تھے۔ گرمی کے ان دنوں میں بھی اکثر لوگوں کو ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی چنانچہ سبھی بارش رکنے کی دعائیں کر رہے تھے۔ ایسے میں بھلانند کے آتا تھی لہذا وقت گزاری کے لیے آپس میں بات چیت ہی واحد سارا تھی۔

میں ظفر اقبال کی باتوں سے اب کسی قدر اکتا چکا تھا اور سلاخوں سے باہر برستی برسات کو دیکھنے میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد یونی میں نے بیرک کے اندر لوگوں پر طائرانہ سی نظر ڈالی۔ آخری کونے والے بستر پر بیٹھا شخص بوچھاڑ میں بھیگتے ہوئے جانے باہر فضاؤں میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ میری نظرس اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ پینتیس چالیس برس کا پروقار شخص تھا۔ مگر سب سے الگ تھلگ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرے قدم اس کی جانب اٹھ گئے۔ میں اس کے قریب پہنچ کر کچھ دیر کھڑا رہا۔ اس نے مجھ پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور سپاٹ انداز میں بولا۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا، مگر وہ مجھ سے بے نیاز دوبارہ بارش کے نظارے میں گم ہو گیا۔ میں نے بھی اسے نوکنا مناسب نہ سمجھا اگرچہ خود کو یوں نظر انداز کیے جانے پر مجھے

خاصی خفت محسوس ہو رہی تھی۔

اس دوران ظفر اقبال نے مجھے وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا لہذا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ قریب آکر وہ بھی چند لمبے خاموش کھڑا رہا۔ بیٹھے ہوئے شخص نے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھا اور دوبارہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

ظفر چند ثانیوں بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے میں وہی مخصوص شکستگی تھی۔ ”ارے بھئی ابو جواد صاحب! کیا آپ کا تعارف ان سے ہوا؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور وہ فوراً رواں ہو گیا۔ ”یہ حضرت شادی شدہ ہیں۔“ میں نے تدریس جیران ہو کر کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا یہاں موجود باقی پاکستانی سبھی کنوارے ہیں؟“

ظفر میری حیرانی سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب! ایسی بات تو نہیں مگر یہ ہمارے مراد صاحب دنیا کے پہلے اور غالباً آخری شوہر ہیں جنہیں اپنی بیوی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے اور عشق بھی ایسا دیا نہیں بلکہ.....“

مراد صاحب ڈانٹنے کے انداز میں بولے۔ ”ظفر! میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے مجھے یہ جگت بازی اچھی نہیں لگتی مگر تم ہر وقت اپنی بکواس جاری رکھتے ہو۔“

ظفر اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ ان کا اپنی شریک حیات سے عشق لیلیٰ مجنوں اور سسی بنوں والا ہے۔ بلکہ بنوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی سسی کو سوتے میں چھوڑ آئے ہیں اور اب ہر وقت اس کی یاد میں آہیں بھرتے رہتے ہیں۔“

اس دوران مراد نے تکیہ نظروں سے ظفر کو گھورا اور اس کا کان مردبے ہوئے سخت لہجے میں بولے۔ ”جاؤ دفع ہو جاؤ۔ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہو کہ مجھے سنجیدگی سے ان کے ساتھ بات کرنے دو۔“

جے پور کے پوتر پانی ☆ 20

ظفر وہاں سے فوراً اٹھ گیا تھا۔ مجھے ظفر اور مراد کے قلبی تعلق کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ مراد کے لمبے میں اس کے لیے پدرانہ شفقت موجود تھی۔

اس کے جانے کے بعد مراد مجھ سے بولا۔ ”یار! معاف کرنا۔ تم خاصی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو اور میں اپنے آپ میں ہی گم رہا خیر! اپنے بارے میں بتاؤ کہ کب پکڑے گئے اور.....“

میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میرے بارے میں تو آپ یقیناً آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ کچھ اپنی سنائیے۔“

اس کے بعد ہم دونوں خاصی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نفیس آدمی ہے لہذا آئندہ اس کے ساتھ گپ شپ جاری رہنی چاہئے۔

کچھ عرصے تک تو مراد کچھ لمبے دیئے رہا اور محض رسی باتوں سے آگے نہ بڑھا اس کا مجموعی رویہ عجیب سا تھا۔ زیادہ تر اپنے ہی آپ میں کھویا رہتا اس روز جیل میں خاصا ہنگامہ تھا۔ راکھی کا تنوار ہونے کی وجہ سے جیل سٹاف اور ہندو قیدی بے گنگے میں مصروف تھے۔ اس خوشی کے موقع پر الور شر کے اناٹھ آشرم سے ایک شفافٹی ٹائفہ قیدیوں کو تفریح مہیا کرنے جیل میں آیا تھا۔ اس ٹائفہ میں چند خواتین فنکارائیں بھی شامل تھیں جو اپنے ناچ گانے سے قیدی بھائیوں کے لیے منور مجن (تفریح) مہیا کر رہی تھیں اور قیدی بھائی ان پر دل و جان سے نذا ہو رہے تھے۔ ایسے میں مراد اور میں ایک درخت کے نیچے کھل بچھائے دور سے اس ہنگامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مراد اس وقت بھی خیالوں میں گم تھا۔ میں نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مراد بھائی! اس وقت تو راحت بھائی کی یادوں کے ظلم سے نکل آؤ۔ زمانے میں محبت کے علاوہ بھی تو بہت سے غم ہیں۔“

وہ چند لمبے انگلیوں سے زمین کریدنے کے بعد پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”تم صحیح کہتے ہو یار! مگر مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔ مجھے تو ہر گھڑی راحت کا خیال رہتا ہے۔“

جے پور کے پوتر پانی ☆ 21

اصل میں تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ راحت کس دلفریب شے کا نام ہے۔“

میں کچھ چڑ کر بولا۔ ”تم کچھ بتاؤ گے تو پتہ چلے گا ویسے کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟“ مراد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں یار! اگر خوبصورتی سے تمہاری مراد چرے مہرے اور جسمانی بناوٹ سے ہے تو وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ ہزاروں یا لاکھوں میں ایک ہے۔ مگر اس کی سیرت کہیں زیادہ دلکش ہے۔ بہر حال اگر تم زیادہ بھند ہو تو میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر مراد پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ چند لمبے اس کی یہی کیفیت رہی پھر آہستگی سے بولا۔ ”میرے والد نمک انار میں ایس ڈی اوتھے جب میں پیدا ہوا۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا۔ لہذا سبھی والدین کی طرح بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ میں پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ میری والدہ فوت ہو گئیں۔ چند سال والد صاحب نے شادی نہیں کی اور مجھ پر بھرپور توجہ دیتے رہے، مگر پھر عزیز واقارب کے اصرار پر شادی کر لی۔“

”وہیں سے میری بد بختی کا دور شروع ہوا۔ میری نئی ماں روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئی۔ میرے تین سوتیلی بھائی پیدا ہوئے تو آہستہ آہستہ والد کی توجہ مجھ پر سے مکمل طور پر فتم ہو گئی۔ میں ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے نئی بد تمیزیاں سیکھتا چلا گیا لیکن یہ ساری باتیں میرے حق میں اور بھی بری ثابت ہوئیں اور ایف اے کرنے تک میرا شمار برادری اور محلے میں انتہائی ناخلف اولاد کے طور پر ہونے لگا۔“

”میں اگرچہ فطری طور پر پڑھائی میں خاصا ذہین تھا مگر بری صحبت کے سبب دھیرے دھیرے واجبی سا طالب علم بن کر رہ گیا۔ گھر سے چھوٹی موٹی چوریوں کرنا میرا معمول بن گیا جس کی وجہ سے والد کے دل میں بھی میرے لیے کوئی نرم گوشہ نہ رہا۔ انہوں نے مجھے جائیداد سے مکمل طور پر عاق کر دیا۔“

”میں پنجاب چھوڑ کر حیدر آباد چلا گیا۔ وہاں میں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں۔“

من اردو ڈاٹ کام

جے پور کے پو تر پانچ ☆ 22

تخوہ وغیرہ جو کچھ ملتا اپنے نشے پر ضائع کرتا۔ اس دوران کئی بار دھمکی وغیرہ کے ذریعے والد سے بھی کچھ رقم لے آتا مگر جس راہ پر میں چل رہا تھا اس پر تو دولت کے کنویں بھی بھرے ہوئے ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں، لہذا روز بروز میری حالت گجرتی چلی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے حیدر آباد کے نواح میں واقع ایک چھوٹی سی زسری پر ملازمت کر لی۔ یہاں میں پودوں کی دیکھ بھال کرتا اور مالک کی غیر موجودگی میں حساب کتاب بھی میرے پاس ہوتا۔

”زسری کا مالک عبدالکریم قیام پاکستان کے وقت بھارت کے علاقے بلند شہر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ نسادات کے دوران اس کا سارا کنبہ مارا گیا تھا۔ اس نے حیدر آباد میں آکر مختلف شعبوں میں قسمت آزمائی کے بعد زسری بنالی۔ وہیں کچھ عرصہ بعد اس نے کسی بے سارا عورت سے شادی کر لی۔ ان کے ہاں ایک ہی لڑکی پیدا ہوئی اور عبدالکریم کی بیوی بھی طویل عرصہ بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئی۔ کریم نے اپنی بیٹی کو بے پناہ پیار دیا اور اسی کے لیے زندگی وقف کر دی۔ میں انہی کے ہاں ملازم تھا۔ اس کی لڑکی راحت اپنے نام کی مناسبت سے واقعی مثالی لڑکی تھی۔

”میرے جیسا جیوان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ زسری کے اندر ہی چھوٹے سے کوارٹر نما مکان میں باپ بیٹی کی رہائش تھی، لہذا میرا آنا جانا بھی اکثر رہتا۔ میں اس دوران بھنگ، چرس کا رسیا ہو چکا تھا۔ راحت اور اس کے باپ کو میری حرکتوں کا اندازہ تھا۔ اس کے باوجود جانے کیوں مجھ پر بھروسہ کرتے تھے۔

”ایک روز راحت نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نشہ وغیرہ اور برے دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دوں تو ہو سکتا ہے اس کے والد اس کے ساتھ میری شادی پر رضامند ہو جائیں۔ یہ ۱۹۷۲ء کے اوائل کی بات تھی۔ میں ذلت کی جن گمراہیوں میں گر چکا تھا، وہاں سے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شریف آدمی اپنی بیٹی کا ہاتھ مجھے سوئپ سکتا ہے۔

”راحت کی زبان میں جانے کیا تاثیر تھی کہ میں نے سیدھی راہ اپنانے کا فیصلہ کر

جے پور کے پو تر پانچ ☆ 23

لیا، حالانکہ اس سے قبل بھی کئی بار اپنے طور پر برائیوں سے باز رہنے کا عہد کر چکا تھا مگر کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب مجھے حیرانی تھی کہ کس طرح چند ماہ میں ایک نیا انسان بن گیا تھا۔ جون ۱۹۷۲ء میں میری شادی انتہائی سادگی سے ہو گئی۔ ہماری شادی میں میری جانب سے میرا دوست ظفر اقبال ہی تھا جبکہ ان کے بھی چند پڑوسیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

”شادی کے بعد مجھے احساس ہوا کہ راحت میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جن کی ہمارا مذہب اور معاشرہ کسی بھی عورت سے توقع رکھتا ہے۔ میری زندگی میں ایسا خوشگوار انقلاب برپا ہوا کہ گزرے ہوئے تمام مصائب تھے کمائیوں کی باتیں محسوس ہونے لگے۔ ۱۹۷۳ء کے مارچ میں میرے گھر خدا نے بیٹی دی۔

”میرے سر بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کے علاج پر بھی خاصا خرچ اٹھنے لگا۔ زسری بھی اوقاف کی زمین پر تھی۔ انہوں نے بھی نوٹس بھجوا دیا کہ چھ ماہ کے اندر یہ زمین خالی کر دی جائے۔ میں اس صورت حال کی بدولت اکثر پریشان رہنے لگا لیکن راحت مجھے ہمیشہ تسلی دیتی کہ کیا ہوا اگر ہمیں زسری اور کوارٹر خالی کرنا پڑے گا تو کہیں بھی کرائے پر رہ لیں گے اور دونوں مل جل کر محنت کر کے گھر کا خرچ پورا کریں گے۔

”مگر اس مرحلے پر دوبارہ میرے دماغ نے پلٹا کھایا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو کسی مشکل صورت حال میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دوستوں کی زبانی مجھے علم تھا کہ اسمگلنگ کافی منافع بخش دھندا ہے۔ میرا باپ اب ایکسین ہو چکا تھا۔ میں ایک بار اس کے پاس بھی گیا تھا مگر اس نے ذلیل کر کے مجھے گھر سے نکال دیا۔ تھکے اوقاف کے دیے ہوئے چھ ماہ کے نوٹس کی میعاد بھی کم ہو رہی تھی، لہذا میں جلد سے جلد کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ظفر اقبال کو بھی پتی پڑھائی کہ اپنی بس کنڈکٹری کی نوکری پر لعنت بھیجے اور میرے ساتھ مل کر اسمگلنگ سے تھوڑے عرصے میں لاکھوں کروڑوں کمالے۔

”یہ بے چارہ ابھی میرے کمنے میں آگیا اور ہم دونوں نے کسی طرح دس کلو چرس

ون اردو ڈاٹ کام

جے پور کے پوتر پانی ☆ 24

خریدی اور سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو گئے جہاں بھارتی سیکورٹی فورس نے ناکا لگا رکھا تھا لہذا ہم دھریے گئے۔ ہم جون ۱۹۷۳ء میں ہندو مل کوٹ کے بارڈر پر گرفتار ہوئے تھے اور ہمیں گنگا نگر میں دو دو سال قید کی سزا ہوئی تھی جو ہم گزشتہ سال بھگت چکے ہیں مگر باقی لوگوں کی طرح ابھی تک نظر بند ہیں۔

میں خاموشی سے مراد کی داستان سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”تم نے اپنی گرفتاری کی خبر اپنے گھر میں دی یا نہیں؟“

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اصل دکھ کی یہی تو بات ہے۔ پہلے ڈیڑھ سال تک تو پاکستان اور بھارت کے سفارتی تعلقات نہ ہونے کے سبب ڈاک کا رابطہ ہی نہ تھا۔ جب اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ڈاک کا نظام بحال ہوا تو میں نے کئی خط لکھے مگر کسی کا جواب نہیں آیا۔ میں نے آتے وقت راحت کو یہی بتایا تھا کہ میں ہفتے کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اس بے چاری کو کچھ علم نہ تھا۔

”اب گزشتہ پونے دو سال میں درجنوں خط لکھ چکا ہوں، مگر کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ ظفر اقبال کی والدہ اور بہنوں کو بھی کئی خط لکھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ حیدر آباد اس پتہ پر گئے تھے مگر وہاں اب کسی زسری کا وجود نہیں۔ وہ ساری زمین اوقاف کی تھی جو خالی کرائی گئی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ میں نے ایک بے سارا معصوم لڑکی کی حفاظت کا ذمہ ساری عمر کے لیے لیا تھا مگر انسانی درندوں کے اس جنگل میں اسے تنہا چھوڑ کر خود جیل کی مضبوط دیواروں کے پیچھے آچھپا ہوں اور مجھے اپنی بچی یا بیوی کی بابت کچھ بھی علم نہیں کہ وہ معصوم جانیں اب کس کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ زندہ بھی ہیں تو کس حال میں!“

یہ کہتے ہوئے مراد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے تھے۔ خود میں بھی آبدیدہ سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”حوصلے سے کام لو۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ کسی بات کی تحقیق کرنے اور اس پر عمل

جے پور کے پوتر پانی ☆ 25

کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، مگرئی الحال ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔“
ماحول بڑا بو جھل سا ہو گیا تھا۔ دور سے ظفر اقبال آتا دکھائی دیا۔ قریب آکر وہ غلاب معمول سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”مراد بھائی! لگتا ہے آج پھر وہی موضوع زیر گفتگو رہا ہے خدا کے بندے! حوصلہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆=====☆

جیل میں رہتے ہمیں خاصے دن ہو گئے تھے۔ جیل کا عملہ کافی دسب کر رہتا تھا کیونکہ انہیں علم تھا کہ یہ لوگ چھوٹی سی بات کو لے کر اجتماعی ہڑتال پر اتر آتے ہیں۔ جیل میں یہ حربہ خاصا کارگر بھی ثابت ہوتا ہے، خصوصاً بھارتی جیلوں میں کیونکہ بھارتی قوم کے ”باپو“ ماتما گاندھی کی تو ساری سیاست ہی ”مرن برت“ کے گرد گھومتی گزرتی تھی لہذا وہاں اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔

اس تمام صورت حال کا ایک منفی نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ چند پاکستانی قیدی بعض اوقات حد سے بھی گزر جاتے اور اکثر ہندو عملے سے تو تکار کی نوبت آتی رہتی۔ بہر حال مجموعی صورت حال قابو میں ہی رہتی۔ جولائی ۱۹۷۶ء کے آخر میں سبھی پاکستانیوں نے اجتماعی ہڑتال کر دی۔ مطالبہ یہ تھا کہ جو پاکستانی سزائیں کاٹ چکے ہیں اور کسی دیگر مقدمے میں مطلوب بھی نہیں انہیں فوراً رہا کر کے پاکستان بھیجا جائے۔

پہلے دو تین روز تو الور کا ضلع کلکٹر رام پال مذاکرات کے لیے آیا لیکن بات آگے نہ بڑھی۔ ہڑتال میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ہڑتال کے پانچویں روز راجستھان کا آئی جی نیل خانہ جات رادھا کانت شرما اور ہوم سیکرٹری لعل چند آئے۔ طویل مذاکرات کے بعد انہوں نے یہ پیشکش کی کہ ہڑتال ختم کرنے کی صورت میں نظر بند پاکستانیوں کو ہر ہفتے پچاس پچاس کی ٹولیوں کی صورت میں پاکستان پہنچا دیا جائے گا مگر ہڑتالی قائدین کا اصرار تھا کہ جب تک انہیں لینے کے لیے بیس جیل کی زیورڈھی پر نہیں آئیں، ہڑتال جاری رہے گی، سو مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

فن اردو ڈاٹ کام

جے پور کے پوتر پانی ☆ 26

ہڑتال کے ساتویں روز ہم میں سے اکثریت کی حالت گہرنے لگی تھی، لہذا جس کی حالت زیادہ تشویش ناک ہوتی اسے فوراً سول ہسپتال لے جایا جاتا جہاں ناک کے راستے اسے زبردستی فیڈ کیا جاتا اور وہیں سے اسے کسی دوسری جیل بھجوا دیا جاتا۔ اس طرح دو روز میں تقریباً پچاس افراد کو بیکانیر، بھرت پور، اور جے پور کی جیلوں میں بھجوا دیا گیا۔ نویں روز جب یہ بات پھیلی کہ توسل شاہ سمیت پچاس آدمی دوسری جیلوں میں بھیجے جا چکے ہیں اور وہاں انہوں نے ہڑتال ختم کر دی ہے تو ہم میں سے اکثر افراد حوصلہ ہاریٹھے اور کوئی ٹھوس مطالبہ منوائے بغیر ہڑتال بری طرح ناکام ہو گئی۔

اس کے بعد جیل حکام کا رویہ خاصا درست ہو گیا تھا۔ غالباً اوپر کی سطح پر پاکستانیوں کو آہنی ہاتھ سے دبانے کی پالیسی طے کر لی گئی تھی۔ اس دوران انور کے جیل سپرنٹنڈنٹ رائے سنگھ کو تبدیل کر دیا گیا اور نئے سپرنٹنڈنٹ دیوی پرشاد تریاخی نے چارج سنبھال لیا۔

اگست کے آخری ہفتے میں رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہو گیا۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو رمضان کی سات اور چھ دنوں کا دن تھا۔ دوپہر کے وقت یونس مسیح نامی پاکستانی روز کی طرح جیل ڈیوڑھی میں پاکستانیوں کی ڈاک وصول کرنے پہنچا تو وہاں موجود حوالدار اور دونوں سپاہیوں نے اسے بلاوجہ بری طرح مارا پیٹا۔

یونس نے واپس پاکستانی وارڈ میں آکر ہم لوگوں کو اس واقعے سے آگاہ کیا تو سب اشتعال میں آ گئے۔ فوراً ہی اکٹھے ہوئے اور آئندہ کی حکمت عملی طے کی جانے لگی۔ اس موقع پر چند لوگوں نے بڑی جذباتی تقریریں کیں، خصوصاً ضلع میانوالی کے رانا لیاقت نے زور خطاب کا بھرپور مظاہرہ کیا اور کہا ”اسلام میں جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ کی سزا کا حکم ہے، لہذا جیل حکام سے مطالبہ کیا جائے کہ مذکورہ حوالدار اور دونوں سپاہیوں کو ہمارے حوالے کیا جائے، تاکہ ہم خود انہیں اپنے ہم وطن یونس کو بلاوجہ پیٹنے کی سزا دے سکیں۔“

جے پور کے پوتر پانی ☆ 27

اس مطالبے پر چشم زدن میں اتفاق رائے ہو گیا۔ چند لوگ اس مطالبے کو انتہا پسندانہ قرار دے رہے تھے۔ اس حوالے سے ہارون آباد کے احمد دین نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”دوستو! جیسا کہ آپ میں سے اکثر حضرات جانتے ہیں کہ میں اپنی عمر کے میں سال سے زیادہ پاکستان، بھارت اور ایران کی مختلف جیلوں میں مختلف الزامات کے تحت گزار چکا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ جیل حکام ہمیں پوری طرح دبانے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں ہیں، لہذا کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں، حالانکہ انہوں نے ابھی تک اڑتی ہوئی دیکھی ہے، پھنستی ہوئی نہیں دیکھی (اس نے یہ الفاظ پنجابی میں کہتے تھے).....“ ”اڑیاں دیکھیاں نہیں تے پھسردیاں نہیں دیکھیاں“..... ”اڑیاں“ پھسردیاں سے مراد فاختائیں ہیں اور منہوم اس کماوت کا یہ ہے کہ تم نے آرام اور سہولت کے دن دیکھے ہیں، مشکل حالات نہیں دیکھے۔)

چند اور افراد کے علاوہ میں بھی اسی رائے کا حامی تھا کہ جوش میں ہوش کا دامن نہیں چھوڑنا نہیں چاہئے مگر ہماری دلیلیں کو بہاد لنگر سے تعلق رکھنے والے کسرتی جسم کے مالک یوسف اراکین نے یکسر مسترد کرتے ہوئے یہ چھیٹی کسی۔ ”بھائیو! ہم میں سے کچھ لوگ آپ کو بزدلی کا درس دے رہے ہیں۔ اب میں اپنا دل نکال کر کس کس کے سینے میں ڈالوں۔“

اس کے جوش خطاب نے مجھے کو پوری طرح سنجیدہ کر دیا تھا اور ہمیں سبھی لوگ ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت وہی حوالدار اور دونوں سپاہی سینہ تلے پاکستانی وارڈ میں داخل ہوئے۔ پھر کیا تھا درجنوں پاکستانی قیدی دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ کا نعرہ لگاتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑے اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے وہ ساری ٹھکانائی انہیں لوٹا رہے تھے جو انہوں نے یونس مسیح کی بلاوجہ کی تھی۔ ہندو حکام نے یقیناً یہ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا تھا فوراً ہی جیل کی

من اردو ڈاٹ کام

فضا خطرے کے الارم کی بے ہنگم آواز سے گونجنے لگی۔ سپرنٹنڈنٹ نے پہلے ہی سے پولیس کی بھاری نظری مشکوار رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جیل پولیس کا عملہ اور ۵۰۰ ہندو قیدیوں کو بھی کھول دیا گیا۔ یہ واقعہ شام کے سوا چھ بجے پیش آیا تھا۔

ایک ہزار سے زیادہ مسلح پولیس اور پانچ سو ہندو قیدی لائشیاں لے کر پاکستانی قیدیوں پر پل پڑے تھے۔ ہر پاکستانی کو فرداً فرداً وحشیانہ طریقے سے مارا گیا۔ باقی بیروں میں بری طرح مار پیٹ کرنے کے بعد ۱۵ نمبر بیرک کا نمبر آیا۔ یہ بیرک ہندو حکام کی نظر میں عرصے سے کھٹک رہی تھی کیونکہ انہیں علم تھا کہ پاکستانی قیدیوں کے تمام چھوٹے بڑے سرکردہ افراد اسی بیرک میں ہیں، لہذا یہ مدت سے ہٹ لسٹ میں سرفہرست تھی۔

سپرنٹنڈنٹ دیوی پرشاد تریپانھی بہ لٹس نفیس بیرک کے باہر کھڑا بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”شاباش بھارت کے ماما کے سپوتو! آج جتنے چاہے لوگ جان سے مار ڈالو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ آج اس کھیل میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ہندو کو چھ ماہ کی اضافی معافی ملے گی۔“ اور ہندو سپاہی اور قیدی ”جے شیو شکر“ اور ”بھارت ماتا کی جے“ کے نعرے لگاتے ہوئے نئے پاکستانیوں پر اپنی بھادری کا سکہ جمارہے تھے۔

دس پندرہ کی ٹولوں میں ہندو ۱۵ نمبر بیرک کے ایک کونے سے شروع ہوتے اور ہم میں سے ہر شخص کو مارتے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ پہلا گروپ دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا اور اس کی جگہ تازہ جتھا مشق ستم میں مصروف ہو جاتا۔ چاروں طرف آہ و بکا جاری تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مگر سپرنٹنڈنٹ تریپانھی کی زیر نگرانی یہ وحشیانہ عمل ابھی جاری تھا۔ اب تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہم میں سے اکثر افراد چیخنے چلانے کے بھی قابل نہیں رہے تھے اور بے سدھ پڑے اپنی بے کسی کا ماتم کر رہے تھے۔

رات ڈھلنے کے سبب ہوا میں خاصی خشکی پیدا ہو چکی تھی۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا اور اس سے ماحول عجیب وحشت ناک ہو چکا تھا اور ہماری بیرک کسی مقتل گاہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس وقت جیل کا ڈاکٹر نیل کننہ آگے بڑھا۔ شاید اس میں انسانیت

کی کوئی رمتن موجود تھی۔ وہ ہڈیانی انداز میں چیختے ہوئے بولا۔ ”مسٹر سپرنٹنڈنٹ! یہ سراسر ظلم ہے۔ یہ انیائے (ظلم) ہے‘ میں ان حالات میں کسی قیدی کا علاج نہیں کروں گا۔“ سپرنٹنڈنٹ تریپانھی شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا اور ڈاکٹر کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے غرایا۔ ”جاؤ جا کر ڈپنری میں بیٹھو۔ الور میں ڈاکٹروں کی کوئی کمی نہیں۔ مجھے اگر ضرورت پڑی تو میں ان کو بلا لوں گا۔“

یہ وحشیانہ کھیل تب اختتام کو پہنچا جب ہندو قیدی اور سپاہی مار مار کر خود تھک گئے۔ بیرک میں ہر طرف لمبو پھیلا ہوا تھا بیرک کی دیواریں، فرش، دریاں، کبیل ہر چیز لمبو رنگ ہو چکی تھی۔ بیرک میں موجود تین افراد کے بے حس و حرکت اجسام لمبو میں لتھڑے جا بے جا فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ تبھی تریپانھی کے حکم پر چیف ہیڈ وارڈن آگے بڑھا اور جھک کر باری باری ہم سب کو دیکھنے لگا۔ ہر چہرے پر اتنا خون جاتھا کہ اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔

ہم تمام افراد کے بازو ٹانگیں کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھیں۔ خود میرا بھی بلایا بازو اور بائیں ٹانگ پٹنڈی سے ٹوٹ چکی تھی اور سر پچھلی جانب سے پھٹ گیا تھا۔ جہاں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔

اسی حالت میں ہم سب کو ہندو قیدیوں اور سپاہیوں نے اٹھا کر جیل ڈیوڑھی میں پہنچایا جہاں پہلے سے پولیس کے بڑے ٹرک ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان سب کے عقبی دروازے کھلے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو قیدی نمبردار پاؤں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے اور ایک جھولا سادے کر دیں کھڑے ہمیں ٹرک کے اندر پھینک دیتے۔ جیسے ہم انسان نہیں بلکہ اناج وغیرہ کے تھیلے ہوں۔ ٹرک کے فرش پر گرتے ہی ہر شخص کے طلق سے طویل چیخ نکلتی عمر وہاں کسے پروا تھی۔ صبح کے تین بجے ہمیں قریبی اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ہماری ٹانگوں اور بازوؤں پر الٹا سیدھا پلستر چڑھا دیا گیا اور سر کی جلد کو سن کیے بغیر ٹانگے لگا دیے گئے جیسے کسی غیر اہم کپڑے کو سیا جاتا ہے۔

آنکھیں بند رکھنا چاہو تو نہ مانو۔ دیسے وہ تینوں واقعی مرچکے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ایک لحاظ سے یہ ان کے لیے اچھا ہی ہوا۔ اگر ہماری قید سے رہائی نہیں پائے تو جیوں کی قید سے تو رہائی پائے۔ تم لوگوں سے تو وہی غیرت والے نکلے۔ اس سنار میں جتنا زندہ رہتے اتنے ہی مزید پاپ اپنے کھاتے میں جمع کرتے۔“

ترپانھی اپنی یادہ گوئی میں مصروف تھا۔ مراد اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہلکے سے بڑبڑایا۔ ”ترپانھی! اگر واقعی ظفر اقبال مر گیا ہے تو سمجھ لو تم بھی مر گئے۔ اس وقت شاید تمہیں یہ بات محض دھمکی محسوس ہو۔ مگر..... ترپانھی! میری بات سنو اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو مجھے ابھی مار ڈالو ورنہ.....“ یہ کہتے ہوئے وہ تکلیف اور تھکن سے ہانپتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

اس کی بات سن کر ترپانھی کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں۔ آگے بڑھ کر اس نے اپنا پاؤں مراد کے چہرے پر رکھ دیا۔ پھر اپنے جوتے کی نوک سے اس کی ٹاک دباتے ہوئے بولا۔ ”جیوتی کی اولاد میں چاہوں تو ابھی تم کو مسل سکتا ہوں۔ میری ملازمت تیس برس ہو چکی ہے اور سروس کے دوران بڑے بڑے تیس مار خان ڈکیتوں اور خونبوسوں سے پالا پڑا ہے۔ اگر میں ایسی گینڈر بمبکیوں سے ڈرنے والا ہوتا تو کب کا گھر جا بیٹھتا۔ دیسے تمہیں ابھی ماروں گا نہیں۔ دیکھتا ہوں تم میں کتنا دم خم ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے مراد کے چہرے سے پاؤں ہٹا لیا اور جیلر سے کہنے لگا۔ ”تینوں مرنے والوں کو سرکاری خرچ پر دفنا دو۔ کیا یاد رکھیں گے کسی مرد سے پالا پڑا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ زنان خانے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ماتحت بھی اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

اس روز یعنی ۴ ستمبر ۱۹۷۶ء کو سہ پہر تک ان تینوں کی موت کی تصدیق کئی اور سنتریوں کی زبانی بھی ہو گئی تھی۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ دوپہر کو انہیں الور کے نواح میں ایک دیران قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ ہم میں سے ہر شخص بری طرح دل گرفتہ تھا۔ بار بار آنکھوں کے سامنے ان تینوں کے چہرے آرہے تھے جو گزشتہ شام تک ہمارا حصہ تھے مگر

وہ گھٹنے بعد صبح پانچ بجے ہمیں جیل واپس لایا گیا۔ مرکزی دروازے کے باہر موجود چھوٹی سی زنانہ جیل میں ہمیں رکھا گیا اور پاؤں میں لوسے کی بیڑیاں لگا دی گئیں۔ تب تک ہم سب کی حالت اتنی غیر تھی کہ اپنے سوا کسی کا کچھ ہوش نہ تھا۔ زنان خانے میں میرے ساتھ ہی فرش پر مراد بھی بے سدھ پڑا تھا۔ تبھی سپرنٹنڈنٹ ترپانھی دو جیلروں اور آٹھ دس نمبرداروں کی معیت میں اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ طنزینہ انداز میں ہمیں گھورتے ہوئے سب کے پاس سے گزرا اور پھر دروازے میں کھڑا ہو کر جیلر سے بلند آواز میں مخاطب ہوا۔ ”جنسی لعل! مرنے والوں کے نام کیا کیا ہیں، انہیں بھی بتا دو، شاید ان میں سے کسی کا عزیز بھی ہو۔“ یہ سنتے ہی ایک لمحے کے لیے ہم سب گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔

جیلر جنسی لعل اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہلکے ہلکے ہنسنے انداز میں بولا۔ ”سرا ابھی تک تو صرف تین ہی مرے ہیں۔ محمد سرور، فتح محمد اور ظفر اقبال۔ دیسے آٹا (امید ہے کہ ان میں سے بھی ایک آدھ پر لوک سدھار جائے گا۔“

ایک لمحے کے لیے ہم میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں آیا تھا، البتہ سبھی نے پیرک کے طول و عرض میں غالبان تینوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی، مگر واقعی ان میں سے کوئی بھی ہمارے درمیان موجود نہ تھا۔ ہم سبھی اپنی تکلیف بھول کر جیلر ترپانھی کی جانب متوجہ تھے۔ دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ شاید ہماری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری نگاہیں جن کو ارد گرد ڈھونڈ رہی ہیں، وہ تو نرک (جہنم) میں بھی پہنچ چکے۔ انہیں تو اس دنیا سے گئے بارہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔“

مراد کراہتے ہوئے بولا۔ ”سپرینٹنڈنٹ! مجھے یقین ہے تم جھوٹ بول رہے۔ تم صرف ہمیں ڈرانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو۔“

ترپانھی نے اپنی لمبی سی فٹیا کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اے میاں! تم جان بوجھ کر

باقیوں نے طیش میں آکر ان تینوں کو قتل کر دیا۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے دعویدار برہمن حکمرانوں سے ہمیں اس سے کم کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔ استغاثے نے بچپن گواہ بھی بنا لیے تھے جنہوں نے عدالت میں آکر بھگوان کی سوگند کھا کر بیان دیا کہ تینوں افراد کے قاتل یہی ستائیس پاکستانی ہیں۔ یہ مقدمہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج الور کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ہم سب ہر پیشی پر مختلف جیلوں سے الور آتے اور پیشی بھگت کر واپس اپنی جیلوں میں چلے جاتے۔ وہیں مراد سے بھی پیشی کے روز مختصری ملاقات ہوتی۔

یہ مقدمہ ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ تک زیر سماعت رہا۔ بظاہر محسوس ہو رہا تھا کہ ہم میں سے اکثر کو اس ناکردہ جرم میں پھانسی یا عمر قید کی سزا ہو جائے گی کیونکہ سبھی گواہ دھڑلے سے ہمیں قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر پھر اچانک حالات نے ہمارے حق میں پلٹا کھایا۔

اندر اگانڈھی نے جون ۱۹۷۵ء سے مارچ ۱۹۷۷ء تک پوری بھارتی اپوزیشن کو ایمرضی نافذ کر کے جیلوں میں بند کر رکھا تھا۔ جب ستمبر ۱۹۷۶ء میں الور میں یہ سانحہ رونما ہوا تو بھارتی اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے لیڈر خود جیلوں میں تھے، لہذا وہ جانتے تھے کہ یہ تینوں قتل حقیقت میں بھارتی سرکار نے کیے ہیں اور ان پاکستانیوں پر ناحق الزام دھر دیا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اندرا گاندھی کو مرکزی صوبائی انتخابات میں کامل شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مرارجی ڈیسائی کی قیادت میں جنتا حکومت بن گئی۔

”راجستھان میں بھی بھیدوں سنگھ شیناوت وزیر اعلیٰ بنے وہ خود بھی اور ان کے وزیر داخلہ پروفیسر کیدار ناتھ شرما اس پورے واقعے کی اصلیت سے واقف تھے، لہذا انہوں نے اپنی انسانیت کا ثبوت ضرور دیا کہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں یہ مقدمہ واپس لے لیا ورنہ اس مقدمے میں ہم لوگوں کو یقیناً لمبی سزا ہوتی۔ مقدمہ واپس ہونے کے بعد مراد سمیت سبھی لوگ پاکستان بھجوا دیے گئے کیونکہ وہ کسی اور مقدمے میں مطلوب تھے اور نہ کسی جرم

آج ان کی بے گور و کفن لاشیں بے نام قبروں میں دبا دی گئی تھیں۔ موت تو ہر شخص کو آتی ہے مگر وطن سے دور ایسی بے کسی کی موت پر جہاں آنسو بہانے والی ایک بھی آنکھ نہ تھی، ناتجہ پڑھنے کے لیے دو ہاتھ بھی نہ اٹھے اور وہ تینوں منوں مٹی تلے ہمیشہ کی نیند جا سوئے..... ہم اٹھ بار تھے۔

ہم سبھی اپنی تکلیف قطعاً بھول چکے تھے۔ رہ رہ کر وہی خیال ذہن پر چھا جاتا، خصوصاً میری آنکھوں کے سامنے ظفر کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا جو کسی بل بھی سنجیدہ نہ ہوتا۔ مراد کی آنکھیں تو جیسے پتھر اگئی تھیں۔ میں گھسٹ کر اس کے قریب ہوا اور بولا۔ ”مراد بھائی! موت نے تو سبھی کو جلد یا بدیر آلینا ہے مگر یقیناً مانو مجھے ظفر کی اس بے وقت موت کا بے انتہا صدمہ ہے۔“

مراد جواب میں خاموشی سے مجھے تنکنا رہا پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ”ہاں اس کی موت بہت بڑا سانحہ ہے بلکہ باقی دونوں کی موت بھی اتنی ہی تکلیف دہ ہے۔ مگر شاید کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ خدا ہر شخص کو تبھی اپنے پاس بلاتا ہے جب وہ اس دنیائے فانی میں اپنا وقت پورا کر چکا ہوتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ زندہ رہ جانے والوں کا ہے جو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ سرور اور فتح محمد کے گھریلو حالات کا تو مجھے علم نہیں مگر ظفر کا باپ پہلے ہی مر چکا ہے۔ چار جوان بنیں اور بوڑھی ماں اسی کی آس پر زندہ تھیں۔ میں تو یہ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ ان کا سامنا کس طرح کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مراد کو دیگر چھ آدمیوں کے ساتھ اودھے پور جیل روانہ کر دیا گیا جبکہ اس کے دو روز بعد مجھے پانچ دوسرے افراد کے ساتھ جو دھپور بھجوا دیا گیا۔ پھر چند ماہ بعد ہم ۲۷ آدمیوں کے خلاف سرے قتل کا مقدمہ شروع ہو گیا۔ بھارتی حکام نے استغاثے میں کہا تھا کہ ہم ستائیس پاکستانیوں نے اور جیل سے فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر عین وقت پر سرور، فتح محمد اور ظفر اقبال نے ہمیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے

من ارادہ وادہ کلام

میں سزا کاٹ رہے تھے۔ مجھے چونکہ پاکستان کے لیے جاسوسی کے الزام میں طویل سزائیں جابجی تھی، اس لیے میں ۱۹۸۲ء کے آخر میں باہمی تبادلے کے ذریعے پاکستان آیا۔

☆=====☆

مراد جنوری ۱۹۷۹ء میں دیگر بینکس پاکستانی نظربندوں کے ساتھ دابگے کے راستے پاکستان پہنچا تھا۔ پاکستانی حکام نے ضروری پوچھناچھ کے لیے چند روز ان سب کو اپنی تحویل میں رکھا اور پھر انہیں رہا کر دیا گیا۔

حیدر آباد اس کے گھر تک جانے کا کرایہ بھی حکام ہی نے فراہم کیا تھا۔ موسم سرما اپنے شباب پر تھا۔ کراچی ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن سے دھیرے دھیرے کھٹکنے لگی تو مراد گاڑی کے شیشوں سے تقریباً چپکنے ہوئے باہر جھانکنے لگا۔ کئی سال بعد وہ آزادی کی حالت میں سفر کر رہا تھا، لہذا اس کی حالت اس بچے جیسی ہو رہی تھی جو زندگی میں پہلی بار گاڑی میں بیٹھا اور تجسس بھری نگاہوں سے ہر چیز کو بغور دیکھ رہا ہو۔

بست کی آمد آمد تھی۔ اس لیے لاہور کے شہری چنگ بازی کے ذریعے اپنی زندہ دلی کا ثبوت دینے پر تلے ہوئے تھے۔ فضا میں چاروں طرف اڑتی چنگلیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ مراد کو اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا بس چتا تو ریل گاڑی کے ڈرائیور کو لاہور کے بعد سیدھا حیدر آباد جا رکنے کا حکم جاری کر دینا۔ کھڑکی کا شیش غالباً کہیں سے تھوڑا ٹوٹا ہوا تھا۔ سرد ہوا کے تھپڑے تسلسل کے ساتھ اس کے خیالات کو منتشر کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد رات کے اندھیرے نے ہر چیز کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا، اس لیے مراد نے گاڑی کے باہر دیکھنا چھوڑا اور ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ گزرے ہوئے لمحات کا ایک ایک پل اسے اپنے سامنے محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن پر راحت کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی تصویریں فلم کی طرح گھومتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد اس نے مراد جیسے اکھڑ مزاج شخص کو اپنا ایسا گردیدہ بتایا کہ وہ

اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ دھما پان سی لڑکی اپنے کردار میں وفا شعاری کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ اس کی خوش اخلاقی، پاک دامن اور وفا کشی نے چند ہی مہینوں میں شوہر کو آزادی سے انسان بنا دیا تھا۔ وہ دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا تھا مگر مالی طور پر ذرا بھی مستحکم نہ تھا۔ اس نے اپنی اس کم مانگی کا اظہار کئی مرتبہ راحت سے کیا بھی تھا، مگر وہ صابر و شاکر لڑکی ہمیشہ عہدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیتی۔ ”آپ خواہ مخواہ ہی غریبی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ آخر ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ دو دقت کی روٹی خدا عزت سے دیتا ہے۔ سر چھپانے کو یہ جگہ بھی ہے۔“

مراد چڑ کر کہتا۔ ”تم آخر کس منی کی بنی ہوئی ہو، کس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہی ہو! دو دقت کی دال روٹی اور اس بوسیدہ کوارٹر کے لیے جسے تم گھر کہتی ہو؟ ارے بیوقوف عورت! میں تو ساری دنیا تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دینا چاہتا ہوں اور دیکھنا میں بہت جلد اپنا عہد پورا کر دوں گا۔“

ایسے مواقع پر وہ ہمیشہ اسے سمجھاتی۔ ”یہ خواہ مخواہ کی حرص بلا جواز ہے۔ خدا نے ہمیں چاند سی بیٹی بھی دے دی ہے۔ بھلا اب اور کیا چاہئے؟“ مگر مراد نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کے لیے ڈھیروں خوشیاں خریدنے کی خواہش کے لیے ذلت کی گہرائیوں میں جا پہنچا۔

اور آج جب وہ لوٹ رہا تھا تو اسے گزرے دقت کے سود زیاں کا مکمل احساس تھا۔ دوسری جانب اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اتنے برسوں اس کا کوئی رابطہ اس سے نہ ہو سکا تو اب اسے کیسے ڈھونڈے گا۔ اب تو اس کی بچی بھی چھ سات سال کی ہو چکی ہو گی۔ ان ہی سوچوں کے دوران اس کا دھیان ظفر اقبال کی جانب لوٹ گیا جسے وہ بھارت ساتھ لے کر گیا تھا اور جو اجنبی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا۔ وہ تو آخری بار اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پایا تھا جس پر مرنے کے بعد مراد کے لیے بہت سارے پیغامات ہوں

کہا۔ ”پہلے تم یہ بتاؤ کہ اگر زندہ تھے تو اتنے سال کہاں غائب رہے؟“ مراد نے التجائی ”چاہا! یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لو کہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا مگر تم راحت کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“ بوڑھا رحیم دین اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا مراد! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی اب تو راحت.....“

مراد نے جلدی سے کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا ہے؟“

رحیم دین بولا۔ ”نہیں وہ ٹھیک ٹھاک ہے مگر اب وہ تمہاری راحت نہیں رہی بلکہ میری بہو بن چکی ہے۔“

مراد کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اندھیل دیا ہو۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ سنا ہے اس کا مطلب وہی ہے جو رحیم دین اسے بتا رہا ہے۔ خاصی دیر بعد وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے خالی نگاہوں سے رحیم دین کو دیکھتا رہا پھر ٹوٹی پھوٹی آواز میں بڑا بڑایا۔ ”مجھے راحت سے یہ توقع نہ تھی۔“

رحیم دین نے سیاٹ لمبے میں کلمہ ”بیٹا! پتہ نہیں تم دونوں میں سے کون کس کی توقعات پر پورا نہیں اترتا مگر جو میں نے بتایا ہے حقیقت وہی ہے!“

رحیم دین کے الفاظ خنجر کی طرح اس کے سینے میں اتر گئے۔ مراد کو اپنے کانوں پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو راستے بھر کی سوچتا آیا تھا کہ اتنے سال غائب رہنے کا کون سا عذر وہ اپنی ”بجٹی“ کے سامنے پیش کرے گا۔ مگر یہاں تو اس کی کائنات ہی لٹ گئی تھی۔ دار اتنا گمراہ تھا کہ وہ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ میری ننھی بیٹی کس حال میں ہے۔

ابتدائی صدمے سے سنبھلنے میں اسے کافی دیر لگی تھی۔ آخر خود کو سنبھالتے ہوئے شکستہ لمبے میں بولا۔ ”چاہا رحیم دین! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے مجھے ساری بات صحیح صحیح بتاؤ۔ میں کسی مزید صدمے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مجھے بتاؤ میری ننھی بیٹی فاطمہ کس حال میں ہے۔ راحت کہاں ہے اس وقت؟“

بوڑھا رحیم اس پر گزرنے والی قیامت کو محسوس کر رہا تھا۔ مراد کے چہرے کے اہار

گئے۔ اس کی ضعیف ماں اور جوان بہنوں کی خوشیوں کا قاتل وہ خود ہی کو سمجھتا تھا۔

انہی سوچوں میں گم وہ حیدر آباد پہنچ گیا۔ سڑک کے دوران رات کو ایک لمحے کے لیے بھی نیند اس کے نزدیک نہیں پھٹکی تھی۔ اسٹیشن سے وہ سیدھا اسی علاقے کی طرف روانہ ہوا جہاں کبھی اس کا گھر تھا۔ زسری اور قریبی کچی آبادی کا نام تک وہاں نہ تھا بلکہ خوبصورت کوٹھیوں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اب اس کی واحد امید لطیف آباد نمبر ۸ میں واقع رحیم دین کا مکان تھا۔

رحیم دین راحت کے باپ عبدالکریم کا اکلوتا دوست تھا۔ جب وہ رکشے سے اتر کر رحیم دین کے چھوٹے سے مکان کی جانب بڑھا اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اتفاق سے بوڑھے رحیم دین نے ہی دروازہ کھولا۔

اس عرصہ کے دوران رحیم دین کی کمر جھک گئی تھی۔ مراد نے اس کو سلام کیا تو وہ آنکھوں پر ہاتھ کر خاصی دیر اسے بغور دیکھتا رہا۔ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

تبھی مراد نے کلمہ ”چاہا رحیم دین! میں مراد ہوں..... عبدالکریم کا داماد۔“

رحیم دین اسے پہچانتے ہوئے بولا۔ ”آجائو مراد بیٹے! اندر آجاؤ۔“

مراد چپ چاپ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت رحیم دین کا بیٹا اور بہو وغیرہ بچوں سمیت کسی عزیز کی شادی میں شریک ہونے کراچی گئے ہوئے تھے لہذا رحیم دین نے مراد کو چھوٹے بیڈ روم میں لے جا کر بٹھا دیا جسے شاید ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

”بیٹھو بیٹا! میں تمہارے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔“ مراد اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

”چاہا! تم یہ تکلفات رہنے دو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ راحت اور اس کے ابا آج کل کہاں رہتے ہیں؟“

رحیم دین کوئی جواب دیے بغیر مراد کو دیکھتا رہا۔ پھر تدریجاً سخت لمبے میں اس نے

چڑھاؤ بغور دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بڑبڑایا۔ ”میں مراد! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہاری اچانک آمد پر خوشی کا اظہار کروں یا پھر تم سے تعزیت کروں۔ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی مراد۔ آخر تم کہاں گم ہو گئے تھے؟“

مراد قدرے تلخ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اتنی مدت کہاں رہا؟ بعد میں بتا دوں گا، مگر آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ میری بیٹی اور بیوی کس حال میں ہیں؟“

رحیم دین دھکی لہجے میں بولا۔ ”مراد! اب کچھ بھی باتیں نہیں بچلے تمہارے جانے کے چند ماہ بعد ہی تمہاری ننھی بیٹی ٹائی فائڈ کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ تمہاری بیوی راحت کا باپ عبدالکریم بھی کچھ بیماری اور کچھ تمہاری گمشدگی کا صدمہ زیادہ دیر برداشت نہ کر پایا اور راحت اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس کے باوجود اس لڑکی نے جس خوشے اور صبر کا مظاہرہ کیا وہ اسی کا حصہ ہے۔ زسری اور کوادر وغیرہ سرکار نے خالی کرالے۔ راحت کا اور کوئی عزیز تو تھا نہیں لہذا ہمیں ہمارے پردوس میں ایک کرے کا کوادر کرانے پر لے کر رہنے لگی۔ گزر اوقات کے لیے محلے کی بیٹیوں کو قرآن پڑھاتی۔ اس کے علاوہ سلائی وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پالتی رہی۔ مگر اس خدا کی بندی نے اپنے کردار پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔“

یہ کہہ کر بوڑھا غالباً سانس لینے کے لیے رک گیا تھا۔ مراد سانس روکے اپنے لٹنے کی داستان سن رہا تھا۔ بے ساختہ بولا۔ ”پھر کیا ہوا چاچا رحیم دین؟“ رحیم انکئی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہونا کیا تھا وہ غریب ہر آن تمہاری منتظر رہی۔ ہر طرح سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ تمہارے والد کے پاس بھی پتہ کرنے گئی مگر انھوں نے نہایت ذلت آمیز طریقے سے دروازے ہی پر سے زحمت کر دیا۔ ہر شخص سے تمہاری بابت پوچھتی مگر کہیں سے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر تمہارے دوست ظفر اقبال کے گھر سے معلوم ہوا کہ ظفر چند دیگر پاکستانیوں کے ہمراہ بھارتی جیل میں مارا گیا ہے تو

اس بے چاری کی آخری امید بھی جاتی رہی۔ سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ ظفر کے ساتھ تم بھی موت کے منہ میں چلے گئے ہو۔ ہم سبھی اس لڑکی کو کہتے کہ اتنی پہاڑ جیسی زندگی کس آسے پر گزرو گی؟ مگر وہ بے وقوف لڑکی کہتی۔ ”چاچا! میں بے آسرا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ ہر پہل میرے میرے مراد کی یادیں رہتی ہیں۔ اسے یقین کامل تھا کہ تم ایک روز لوٹ آؤ گے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ آس کی ڈوری ٹوٹی چلی گئی۔ وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔“

”محلے کے سب چھوٹے بڑے اس کی شرافت کے سبب اس کی عزت کرتے تھے مگر اس مسئلے کا حل کسی کے پاس بھی تو نہیں تھا۔ جب تمہیں لاپتہ ہوئے پانچ برس بیت گئے تو محلے کے سبھی بزرگوں نے اسے مشورہ دیا کہ اب مراد کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ وہ عقد ثانی کر لے، مگر وہ تو ایسی بات سننے کی بھی روادار نہ تھی۔ ایسی صورت حال میں محلے کے بزرگ خطیب مولوی یحییٰ نے مذہب و اخلاق کے سبھی تقاضوں کا حوالہ دے کر اسے قائل کر لیا کہ اب اس کے سامنے دوسرا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ اگر اولاد ہی ہوتی تو وہ اس کے سارے زندگی گزار دیتی۔ لہذا خود میں نے بھی اس سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو میں اپنے بیٹے محمد شریف سے اس کا نکاح کر دوں جس کی بیوی کچھ عرصہ پہلے دو کم سن بچوں کو چھوڑ کر وفات پا گئی تھی۔“

”کچھ عرصہ تو وہ پس و پیش کا مظاہرہ کرتی رہی۔ مگر سات ماہ پہلے اس نے شادی کی ہابی بھری اور اب ماشاء اللہ شریف کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے۔ بلکہ میرے دونوں کم سن پوتوں کو اس نے وہ پیار دیا ہے جو حقیقی ماں بھی مشکل سے دے پاتی۔ ویسے وہ اب بھی ہر دم کھوئی سی رہتی ہے اور ہر بات میں تمہارا ذکر لے بیٹھتی ہے۔ وہ چند روز قبل ہمارے عزیزوں کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی گئی ہوئی ہے اور امید ہے آج کل میں واپس آ جائے گی۔“

مراد بت بتا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے بوڑھے کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس

ہو رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ کن سہانے سپنوں کے ساتھ وہ واپس لوٹا تھا مگر منزل پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ منزل اس سے ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی ہے۔ گھر واپسی پر اسے پہچاننے والی کوئی ہستی باقی نہیں بچی تھی۔ کوئی شخصیت ایسی نہ رہی تھی جو بتاتی کہ اس کے بنائے ہوئے موسم کیسے بیتے ہیں۔

ابھی وہ دونوں باتوں ہی میں مصروف تھے کہ گھر کے باہر رکشہ کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد دو ننھے منے بچے بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اپنے دادا کے پاس ایک اجنبی کو بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تبھی بیرونی دروازہ کھلا اور کوئی دوسرا اندر داخل ہوا۔

مراد دروازے کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والی شخصیت کوئی اور نہیں اس کی راحت تھی۔ جس نے سادہ پرنٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ مگر اس سادگی میں بھی چہرے کی معصومیت نے اس کی شخصیت میں خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ مراد کو سامنے دیکھ کر وہ یک دم مبہوت سی ہو گئی تھی۔

ایک پل میں جانے والے دونوں اطراف کتنی قیامتیں گزر گئیں۔ راحت کے چہرے پر چند ثانیوں میں کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ جن میں بے پایاں مسرت کا رنگ سب پر غالب تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ انداز میں مراد کی جانب اٹھے تھے۔ لگتا تھا جیسے مراد کو اپنی آغوش میں بھر لینا چاہتی ہو، مگر یہ کیفیت لمحاتی تھی۔ چند قدم اٹھانے کے بعد پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے اور پھیلے ہوئے ہاتھ غیر ارادی طور پر نیچے ہو گئے۔

البتہ آنکھیں زبان بن گئی تھیں۔ دل پھٹل کر آنکھوں میں تیرنے لگا۔ صورت حال کی سنگینی محسوس کر کے بوڑھا راجیم دین کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ دونوں بت بنے کتنی ہی دیر اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا گویا کائنات تھم گئی ہو اور آج کے بعد کاروبار حیات میں کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ خاموشی کا یہ سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگر راحت آگے بڑھ کر

مراد کو کندھے سے نہ جھنجھوڑتی۔ ”مراد! یہ تمہی ہونا! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟“ مراد اس کا ہاتھ نرمی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”کاش! یہ خواب ہی ہوتا مگر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا راحت؟“ وہ گویا خواب سے جاگ گئی تھی۔ کس قدر تلخ انداز میں بولی۔ ”مراد! خدا کے لیے مجھے قصور وار نہ ٹھہرائے۔ میں نے تمہارا جتنا انتظار کیا وہ میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ بچی کی وفات کی بعد تمہاری راہ نکلتے مجھ پر جو گزری ہے شاید ہی تم اس کا اندازہ لگا سکو۔ ایک ایک پل میں نے کیسے کاٹا، اب اس کے ذکر سے کیا حاصل؟ کاش! تم کسی طرح مجھے اطلاع دے دیتے کہ تم زندہ ہو تو میں ساری عمر تمہارے نام کے سارے گزار دیتی۔ مگر تم تو ایسے گئے جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے اور حالات کی گردش نے آج ہمیں ملایا بھی ہے تو کس موڑ پر.....“

مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جذبات سے عاری آواز میں بولا۔ ”راحت! میں تمہیں کسی طرح قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہ تھے۔ ویسے کنارے پر پہنچ کر ڈوب جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔“

راحت سامنے بیٹھ کر ٹھہرے ٹھہرے الفاظ میں خود پر گزرنے والی قیامت سے اسے آگاہ کر رہی تھی۔ ”..... اور پھر میں نے سب کے مجبور کرنے پر شادی کر لی اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ صرف نام کا شریف نہیں بلکہ حقیقتاً ایک شریف النفس انسان ہے۔ اگرچہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میرے دل و دماغ پر تم ہی سوار تھے، مگر اس نیک شخص نے کبھی میری تضحیک نہیں کی بلکہ ہر ممکن طریقے سے تمہاری کھوج میں مصروف رہا۔ اس کے دونوں معصوم بچے بھی مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، اور اب تو چند ماہ تک میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

مراد اب خود پر مکمل قابو پا چکا تھا۔ ”راحت! مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی رلہ وفا سے نہیں بھٹکا۔ مگر حتیٰ فیصلے تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ شاید اسے ہمارا دائمی سنجوگ منظور نہیں تھا، لہذا اس طریقے سے ہمیشہ کے لیے ہماری راہیں جدا کر دی

گئیں۔ خدا تمہیں اور شریف کو خوش رکھے۔ گزرا ہوا وقت مکمل طور پر بھول جانے کی کوشش کرتا۔ یہ سمجھ لو کہ وہ ایک بھیانک خواب تھا۔

راحت کی آنکھوں سے سادون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ”مراد! اس وقت کو بھیانک خواب مت کہو۔ وہ تو ایسا سنا پنا تھا جس کے تصور کے سارے تمام زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ وہ دور تو میری زندگی کا حاصل ہے مگر اب.....“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا تاکہ مسلسل گرنے والے اشکوں کے سیلاب سے دونوں ہی بہ نہ جائیں۔

مراد سپات آواز میں بولا: ”اپنے آنسو تھام لو راحت ورنہ یہ ہم دونوں کے ارادوں کو متزلزل کر دیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد رحیم دین اور شریف بھی آگئے۔ شریف مراد سے بڑی اپنائیت کے ساتھ ملا۔ راحت نے کھانا تیار کیا اور بھی نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا، لیکن اپنی جگہ سبھی ایک جیسے خیالات میں غم تھے۔ مراد اس ماحول میں مزید رک کر بھی کا سکون برپا نہیں کرنا چاہتا تھا، لہذا کھانا کھانے کے بعد بولا: ”اچھا بھی شریف صاحب! میں آج شام واپس لاہور جانا چاہتا ہوں، جہاں چند ضروری کام بنانے ہیں۔“

راحت نے بے ساختہ اس کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کے شکوے تھے اس کے باوجود اسے روکنے کے لیے کسی نے اصرار نہ کیا کیونکہ اس کی ذہنی کیفیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ بھی ان لوگوں سے رابطہ رکھے گا۔ راحت اور شریف کا اصرار تھا کہ وہ دونوں اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ کر آئیں گے مگر اس نے ملازمت سے انہیں منع کر دیا۔ شریف نے باہر جا کر رکشے کا بندوبست کیا۔

رخصت ہوتے وقت راحت شکستہ لہجے میں بولی۔ ”اپنا خیال رکھنا مراد!“ اس کے ان الفاظ میں چھپی اپنائیت محسوس کر کے جانے کیوں مراد کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

رکشہ روانہ ہونے کے بعد بوڑھا رحیم دین راحت کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی! معلوم نہیں اس کا نام مراد کس نے رکھا تھا۔ یہ بے چارہ تو ساحل مراد پر پہنچ کر بھی نامراد ہی لوٹا ہے۔“ راحت نے کوئی جواب دیے بغیر دوپٹے کے پلو سے اپنی پلکوں کے پھیلنے کوٹنے صاف کیے اور گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

ون اردو ڈاٹ کام

☆ 45 جے پور کے پوتر پانی

کال بیل کا بٹن دبانے کے چند لمحوں بعد گیٹ کا چھوٹا بظلی دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص نے سر باہر نکال کر جھانکا اور سوالیہ نگاہیں مراد کی جانب اٹھیں۔ مراد چند لمحوں کے لیے کچھ سیٹا سا گیا تھا۔ "جی یہ ظفر اقبال صاحب ہی کا مکان ہے نا؟"

اجنبی شخص نے اسے مشکوک انداز سے گھورتے ہوئے بولا۔ "کون ظفر اقبال؟" میاں ہم گزشتہ تین سال سے اس میں رہ رہے ہیں۔"

مراد کچھ شش رنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ "جناب! یہاں چند سال پہلے ظفر نام کے صاحب رہتے تھے۔ ان کی والدہ کا نام سکیمنہ بی بی تھا۔" وہ مراد کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ "آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"جی میں ان کا عزیز ہوں۔"

وہ شخص غالباً بحث کی موڈ میں تھا۔ باہر آکر اس نے کہا۔ "آپ کیسے عزیز ہیں جنہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ سکیمنہ بی بی انتقال کر چکی ہیں۔"

مراد کو یہ سن کر صدمہ ہوا، مگر اس شخص کی جرح سے تنگ آتے ہوئے اس نے کہا۔ "میں خاصاً عرصہ بیرون ملک رہا ہوں لہذا ان کے موجودہ احوال سے واقف نہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکیں تو مہربانی ہوگی۔"

وہ شخص کچھ نرم پڑتے ہوئے گویا ہوا۔ "میرا نام محمد دین ہے۔ ہم نے چند سال پہلے نور بانو سے یہ مکان خریدا تھا۔"

مراد کو علم تھا کہ ظفر کی بہنوں میں سے بڑی کا نام نور بانو ہی تھا۔ جلدی سے بولا۔ "جی دراصل مجھے اسی سے ملنا ہے۔ کیا آپ کو ان کا موجودہ ایڈریس معلوم ہے؟"

ادھیڑ عمر محمد دین چند لمحوں کے لیے کچھ سوچتا رہا۔ پھر جواب دیا۔ "وہ فیصل کالونی تھانے کے پاس ہی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

مراد کو اس کا یہ رویہ خاصاً گراں گزر رہا تھا مگر کیا کر سکتا تھا۔ دھیرے سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ واپس چوک میں آکر اس نے فیصل کالونی کے لیے ٹانگہ لیا۔ اس دوران اس کا

واپسی کے سفر میں مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جب ریل گاڑی حیدر آباد اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو اسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھٹانے سے ٹوٹ گئی ہو اور اس کے جسم کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو کر دوڑ رہا ہو۔ وہ خود کو بڑا کھوکھلا سا محسوس کر رہا تھا۔ بظاہر اس کی نظریں کھڑکی کے شیشے پر جمی تھیں مگر ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔

سب کچھ جاہ ہونے کے بعد اسے مزید زندہ رہنے کا کوئی جواز سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ اب وہ کس لیے اور کس کے لیے جینا چاہتا ہے۔ سمجھی اس کے ذہن میں ظفر اقبال کا خیال آیا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے عجیب شاک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہو کہ مجھے بالکل ہی بھلا دیا۔ کیا میرے گھروالوں کا تم پر کوئی حق نہیں؟ یہ خیال آتے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوراً اس کے گھر جا کر اس کی ضعیف ماں اور بہنوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرے گا۔

حاصل پور پہنچنے کے بعد اسے ظفر کے محلے تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ وہ چھ سال قبل آخری بار اس چھوٹے سے محلے مسلم آباد میں آیا تھا۔ اب اس کی آبادی خاصی پھیل چکی تھی۔ چوک میں ٹانگے سے اترنے کے بعد اپنی یادداشت کے مطابق اس نے ظفر کے گھر کا رخ کیا۔ پتلی سی گلی کے آخری سرے پر واقع مکان کے دروازے پر پہنچ کر وہ کچھ ٹھنک سا گیا کیونکہ پہلے یہ مکان محض دو پرانے کدوؤں پر مشتمل تھا جبکہ اس وقت اس کے سامنے خوبصورت تین منزلہ عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی اور جس دروازے پر ٹٹ کا پرانا سا پردہ جھولا کرتا تھا اس کی جگہ لوہے کے بڑے سے گیٹ نے لے لی تھی۔

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔

دس منٹ کا سفر کر کے اس شرمناک قصبے کے نواح میں پہنچ کر تانگے والے نے کہا۔
”ہاؤ جی! یہی فیصل کالونی ہے۔“

اترتے ہوئے مراد نے چاروں جانب نگاہ ڈالی تو احساس ہوا کہ بہت صاف ستھری آبادی ہے۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد آگے بڑھا تو چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جنرل سٹور سے اس نے تھانے کے قریب رہائش پذیر نور بانو کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا داہنی سڑک پر چوتھی کوٹھی اسی کی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے دکان دار نے معنی خیز نظروں سے اسے گھورا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جناب! بھلا نور بانو کو کون نہیں جانتا؟ وہ تو یہاں کی ممتاز شخصیت ہیں۔“

مراد کو اس شخص کا لہجہ اور انداز عجیب سا لگا تھا۔ بہر حال وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک کوٹھی نما مکان کے باہر کھڑا تھا۔ تیل بجانے کے چند لمحوں بعد ایک عمر رسیدہ عورت نے دروازہ کھولا۔ ”جی آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

مراد کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا، مگر اپنی حیرانی کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ ”محترمہ نور بانو گھر میں ہیں تو انہیں بلا دیں۔“

بوڑھی عورت کی نگاہوں میں عجیب سی شیطانی چمک کی لہر اٹھی۔ ”آئیں صاحب جی! آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں بانو بی بی کو اطلاع کرتی ہوں۔“

مراد اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کی حیرت مزید بڑھ گئی۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ فرش پر خوبصورت قالین بچھا تھا اور دیوار کے ساتھ قیمتی صوفے بڑی ترتیب سے رکھے تھے۔ کھڑکی اور دروازوں پر ملتے جلتے رنگوں کے پردے لہرا رہے تھے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے بوڑھی خادمہ کمرے سے نکل گئی۔

مراد کو یہ سارا گورکھ دھندا عجیب سا لگا رہا تھا۔ وہ تو راستے بھر سوچتا آیا تھا کہ یہ

بد نصیب خاندان جانے کس طرح دو وقت کی روٹی پوری کر رہا ہوگا، مگر یہاں تو ساری صورت حال ہی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی اور اس کی کوئی فوری توجیہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک بار تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہے ورنہ ظفر کی بہن بھلا ایسے ٹھانڈے ہاتھ کی متحمل کیسے ہو سکتی ہے! ممکن ہے یہ نور بانو کوئی دوسری خاتون ہو۔

وہ ابھی سی ایڈجسٹمنٹ میں مصروف تھا کہ پردہ ہٹا کر نور بانو اندر داخل ہوئی۔ اس کی چال ڈھال میں ایک خاص قسم کا طمطراق تھا لیکن سامنے بیٹھے مراد کو دیکھ کر وہ یکدم ٹھنک سی گئی تھی۔ وہ درجنوں بار ظفر اقبال کے گھر آچکا تھا۔ لہذا اس کی ماں اور بہنیں اسے اچھی طرح جانتیں تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

نور بانو کے چہرے کی شادابی ایک لمحے ہی میں زردی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ مراد صاحب ہی ہیں، ظفر بھائی کے عزیز ترین دوست۔“

مراد فوراً کچھ نہ بول سکا۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”ہاں نور بانو! میں ہی ہوں۔“

وہ قدرے تلخ لہجے میں کہہ اٹھی۔ ”تو مراد صاحب! آپ واپس آئی گئے مگر اکیلے۔ میرا بھائی ظفر کہاں ہے جسے آپ دولت مند ہونے کا سپنا دکھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے؟“

مراد افسوس اور ندامت کی زیادتی سے فرش پر ٹکاپیں جمائے بیٹھا رہا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کا بھائی وہاں جا چکا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہ کیفیت خاصی دیر برقرار رہی۔ اس خاموشی کو بانو ہی نے ختم کیا۔ ”مراد صاحب! مجھے معلوم ہے میرا اکلوتا بھائی اب کبھی واپس نہیں آئے گا کیونکہ وہ منوں مٹی اودھے بھارت میں کسی جگہ ابدی

تھا، لیکن اس بوڑھی کی جمانیدہ نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں تیرنے والے آنسو نہیں چھپے تھے، تاہم وہ کسی قسم کا اظہار کیے بغیر باہر نکل گئی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نو وارد عام قسم کا صہبان نہیں بلکہ اس کا کوئی خاص پس منظر ہے۔

مراد گم مہم بیٹھا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جسے چند برس پہلے ڈھنگ سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی۔ مگر آج اس کے کسی سوال کا جواب مراد کے پاس نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھاری آواز میں بولا۔ ”نور بانو! مجھے احساس ہے کہ یہاں آکر میں نے تمہارے پرانے زخم ہرے کر دیئے ہیں لہذا اب مجھے اجازت دو۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“

بانو تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”مسٹر مراد! یہ زخم بھرے ہی کب تھے۔ یہ تو زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ مجھے پتہ ہے میری باتوں سے آپ کو صدمہ ہوا ہے، مگر کیا کروں آخر میں ظفر کی بہن ہوں۔ آج عرصے بعد ایک ہمدرد کو سامنے دیکھا تو خود پر قابو نہیں رہا۔ ویسے آپ ابھی جانے کا خیال بھول جائیں۔ ابھی تو میں نے آپ کی خیریت بھی دریافت نہیں کی۔ ہماری راحت بھابی کس حال میں ہیں۔ وہ تو اتنے عرصے بعد آپ کو زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے پاگل سی ہو گئی ہوں گی۔“

مراد نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔ ”اس ذکر کو رہنے دو بانو! اسے سن کر مزید دکھی ہو جاؤ گی۔“ پھر اس نے نور بانو کے اصرار پر راحت کی دوسری شادی اور اپنی بچی کے انتقال کی بابت اسے تفصیل سے بتا دیا۔

نور بانو نے اس دوران اسے ٹوکا نہیں تھا اور بات مکمل کرنے کا موقع دیا تھا۔ آخر میں اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تو آپ بھی اپنا سب کچھ لٹا چکے ہیں، لیکن میں اس پر انوس کا اظہار اس لیے نہیں کروں گی کہ ان رسمی باتوں سے اب مجھے وحشت سی ہونے لگی ہے۔ بہر حال شاید اسی کا نام زندگی ہے۔“ اس دوران اس نے ملازمہ کو بلا کر ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بھی ملاقاتی آئے تو اسے بتا دیا جائے کہ بی بی گھر پر نہیں۔

سگریٹ سلگانے کے بعد مراد نے دھیرے سے کہا۔ ”نور بانو! ایک بات میرے ذہن

نہیں سو رہا ہے۔ اپنی بہنوں کو سالتوں کا روپ دینے کا خواب لیے رہے ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ چند سال پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔“ اس کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا، مگر آنکھوں کے بھیگے گوشے اندرونی کرب کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس نے بظاہر کوئی تلخ بات نہیں کہی تھی۔ اس کے باوجود اس کا ہر لفظ مراد کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا کیونکہ اسی نے ظفر کو بھارت جانے کے لیے اکسایا تھا اور یہ بات بانو سمیت ظفر کے سبھی گھر والوں کو معلوم تھی۔ اسی وجہ سے مراد اس سامنے کے لیے خود کو ذمے دار سمجھتا تھا۔ اپنے حواس بمشکل مجتمع کرتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ”بانو! میں تم سب لوگوں کا مجرم ہوں۔ اصل میں ظفر کا قاتل میں ہی ہوں۔ تم جو بھی سزا درد مجھے منظور ہے۔“

بانو اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی نہایت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ ”مراد صاحب! اب اس ذکر کا کیا فائدہ۔ شاید اسی کا نام تقدیر ہے۔ ویسے تمہیں کیا معلوم ظفر کے چلے جانے سے ہمارا کیا کچھ کھو گیا۔ تم کس کس جرم کی سزا بھگتو گے؟“ وہ اب قدرے تلخ ہو گئی تھی اور آپ سے تم پر اتر آئی تھی۔

اس کا لہجہ خاصا جارحانہ ہو چلا تھا۔ ”کیا تمہیں سزا دینے سے میرا ماں جلیا داپس آجائے گا؟ کیا تم بوڑھی ماں کی پھرائی آنکھوں میں زندگی ڈال سکتے ہو جو بیٹے کے انتظار سے مایوس ہو کر خود بھی اسی کے پاس چلی گئی؟ اور پھر کیا تم میری آبرو واپس دلا سکتے ہو جو قدم قدم پر پامال کی گئی۔ میرے اس کڑیل اور معصوم بھائی کا کون سا نعم البدل ہے تمہارے پاس جو بہنوں کی طرف میلی نگاہ اٹھانے والے کی آنکھ نکالنے کی جرأت رکھتا تھا؟ مسٹر مراد! یہ رسمی باتیں رہنے دو۔ ہم بھی اسے بھلا چکے ہیں۔ اگر بتانا ہی ہے تو یہ بتاؤ کہ میرے ماں جانے کے آخری لمحات میں مجھے یاد کیا تھا یا نہیں اور کیا اس کی قبر کا کوئی نشان باقی ہے جہاں جا کر میں فاتحہ پڑھ سکوں؟“

اسی دوران ملازمہ چائے لے کر اندر آ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر بانو نے خود پر قابو پایا

میں دیر سے کھٹک رہی ہے اگر محسوس نہ کرو تو میں پوچھتا چاہوں گا کہ ظفر کے بعد تم لوگوں نے اپنے معاشی مسائل کیسے حل کیے۔ تم لوگوں کی مالی حالت بظاہر ایسی نہ تھی کہ حالات معمول کے مطابق چلتے رہتے۔

وہ شاید پہلے ہی اس سوال کی منتظر تھی۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی اور پھر سپاٹ انداز میں کہنے لگی۔ ”مراد! آپ ہمارے گھر کی معاشی زبوں حالی سے تو واقف ہی ہیں۔ ظفر تمہارے ساتھ چلا گیا، ماں کو ایک بہتر مستقبل کا سہنا دکھانے کے لیے معلوم تھا کہ اس خواب کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی۔ جب تم لوگوں کو گئے کئی ماہ بیت گئے تو ہماری مالی حالت مزید پتلی ہو گئی۔ جب تم لوگوں کو گئے کئی ماہ بیت گئے تو ظفر بھائی بس کند کھڑی سے جو تھوڑے بہت پیسے لاتے تھے ان سے دال روٹی چل جاتی تھی۔ جو تھوڑا بہت پس انداز کیا تھا وہ بھی چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ ماں نے بیٹیوں کے بیاہ کی خاطر جو چند تولے زیور بچا کر رکھا تھا اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی آخر کتنا عرصہ ساتھ دیتی۔“

یہ کہہ کر بانو خاموش ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں حسرت و یاس کے سائے لہرائے لگے تھے۔ مراد بت بنا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اپنی بات مزید آگے بڑھاتی ہوئی چند ثانیوں بعد وہ بولی۔ ”ماں کی حالت بیٹے کی جدائی اور معاشی بد حالی نے مزید بگاڑ دی تھی۔ پہلے تو وہ ارد گرد سے سلائی کے کپڑے لے آتی تھی۔ ہم چاروں ہمیں سی کر دال روٹی چلاتی تھیں، لیکن ماں کی بیماری سے یہ سلسلہ بھی بند ہوتا دکھائی دیا۔ اس مرحلے پر سب سے بڑی ہونے کے ناتے مجھے گھر سے باہر نکلتا پڑا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے ماضی کی یادوں میں کھو کر خاموش ہو گئی تھی۔ پھر خود ہی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”یہ جھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں تب بھی روزگار کے مواقع انتہائی محدود تھے۔ قصبے کے اکلوتے پرائیویٹ ہسپتال فراز کلینک میں مجھے آن نرسنگ نرس کی ملازمت مل گئی جہاں سے چند سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ کھاتے پیتے مریض صحت یاب ہونے پر بعض اوقات بخشش بھی دے جاتے۔ ۱۹۷۶ء کے آخری

مہینے میں قریبی گاؤں کا ایک سنگٹھار رسول بخش بھارتی قید کاٹ کر آیا تو اس نے ظفر کی موت سے آگاہ کیا۔ یہ محسوس خبر سننے کے بعد بوڑھی ماں چند روز بعد ہی ہم بہنوں کو تنہا چھوڑ کر ابدی نیند جاسوئی۔ مرنے کے بعد بھی اس ضعیف عورت کی آنکھیں اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنے کی آس میں کھلی رہیں۔ اس سانحے کا ایک ایک لمحہ آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ بے سارا عورت کو جب یقین ہو گیا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے تو اس کی بے بسی دیدنی تھی۔ اس ماں کی حالت کا اندازہ تم با آسانی لگا سکتے ہو۔ جس کی چار بچیوں کا اس کے بعد دنیا میں کوئی دوسرا سارا نہ ہو۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ شاید وصیت یا نصیحت کے لیے اس کے پاس بچا ہی کچھ نہ تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد ہم بہنوں کے لیے دنیا اندھیرا ہو گئی تھی۔ لگتا تھا وقت کا پیسہ ختم گیا ہے، لیکن وقت بھی کبھی رکا ہے۔ محلے داروں اور دور پار کے رشتے داروں نے ترس کھا کر ماں کی تجیز و تکفین کے فرائض انجام دیے۔ ہمیں دلا سے دیئے گئے، صبر کی تلقین کی گئی، مگر یہ سب کچھ محض چند روزہ تھا۔ اس کے بعد اس وسیع و عریض زمین پر ہم تنہا کھڑی تھیں اور دور دور تک آس کا ہلکا سا سایہ بھی نہ تھا۔

”کچھ دنوں بعد میں نے اپنی ملازمت پر دوبارہ جانا شروع کر دیا، لیکن چند ہی روز میں احساس ہوا کہ ضعیف ماں نے اپنی ناتوانی کے باوجود ہم بہنوں کو اپنے پروں کے نیچے محفوظ کر رکھا تھا۔ برگد کا وہ بوڑھا مگر سایہ دار پیر کیا گرا، ہم سارے جہاں کے لیے تماشا بن کے رہ گئیں۔ میں شام کو تھکی ہاری کام سے واپس آتی تو محلے کے چوک سے گھر کی دہلیز تک کئی بھتیوں کا سامنا کرتی۔ اچھے بھلے لوگ آوازے کتے اور میری نوکری اور کردار کے نوالے سے عجیب و غریب تبصرے کیے جاتے حتیٰ کہ میرے ہونے والے سسرال نے ہمارے گھر آکر منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔

”چند ماہ تو میں یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن یہ سلسلہ رکنے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔ آس پڑوس کی اکثر ماؤں نے اپنی ہو بیٹیوں کو ہمارے گھر آنے سے منع کر دیا کیونکہ

ان کے خیال میں ہم بہنیں شریفوں سے میل جول کے قابل نہیں رہی تھیں۔ میں یہ سب برداشت کر جاتی، مگر اپنی تین چھوٹی جوان بہنوں کی ذمہ داری کا احساس مجھے اندر سے چات رہا تھا۔ دو وقت کی روٹی تو جیسے تیسے پوری ہو رہی تھی لیکن جب ان کی شادی کا سوچتی تو دہل کر رہ جاتی۔ ماں اور بھائی رات ہی ملک عدم ہو چکے تھے اور جو زندہ بچے تھے ان کے لیے مجھے ہی سب کچھ کرنا تھا، لہذا میں نے بہت سوچ سمجھ کر ان دیکھی راہوں پر چلنے کا شعوری فیصلہ کر لیا۔

مراد یہ سن کر بری طرح چونکا تھا۔ صوفے پر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں تم کن آن دیکھی راہوں کا ذکر کر رہی ہو۔“

اندر سے وہ اس کی بات سن کر بری طرح سہم گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کے اندیشے حقیقت کا روپ دھارنے والے ہیں۔

نور بانو خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی تھی۔ لگتا تھا اس نے مراد کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”مراد صاحب! اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل میں نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔ مگر نہیں میں آج تمہیں بتا کر رہوں گی کہ تمہارے اور ظفر کے غلط فیصلوں اور زیادہ پیسہ کمانے کی بے جا خواہشات نے ہمیں کیسا ”روشن مستقبل“ فراہم کیا۔“

”اس روز کے بعد سے میں نے وہ مکان چھوڑ دیا اور بہنوں کو لے کر دوسرے محلے میں منتقل ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ محنت مزدوری کرنے کے باوجود مجھے بے سربا ازمات کا شکار ہونا پڑتا ہے تو کیوں نہ میں یہ ہمتیں اپنا مقدر بنا لوں۔ تبھی سے میں نے وہ راستہ اپنا لیا جو ہزاروں سال سے عورتوں کی قلیل تعداد نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد میں ایک مذہب طوائف بن کر رہ گئی۔“

مراد کا ذہن یہ تلخ سچائی قبول کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ سرزنش کے انداز میں اس نے کہا۔ ”نہیں! نور! بانو! ایسا مت کہو۔ کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔“ مگر وہ مضبوط آواز

میں کہنے لگی۔ ”نہیں! یہی تو ایک سچائی ہے، البتہ میں یہ حلفیہ کہتی ہوں کہ خود اس راہ پر چلنے کے باوجود میں نے اپنی بہنوں کی حفاظت ایسے ہی کی ہے جیسے کوئی بھی باکردار والدین کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی بد اعمالیوں کو بڑے خوبصورت ڈھنگ سے چھپائے رکھا تاکہ میری بہنوں پر میری بدنامی کے پھینٹے نہ پڑ سکیں۔ میں نے دو سال کے عرصے میں تینوں کی شادی نسبتاً معقول مگر شریف گھرانوں میں کر دی جہاں وہ اب پرسکون ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میں نے اپنا پرانا مکان بیچ دیا تھا اور کرائے پر اس کو ٹھی میں رہ رہی ہوں۔ کافی پیسہ اکٹھا کر چکی ہوں، لیکن کردار کے اعتبار سے اب بھی اسی روش پر قائم ہوں بلکہ اب تو میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔“

اس کی طویل مگر المناک داستان نے مراد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی پریشانی بھول کر اس معاشرتی سانچے پر آنسو بہا رہا تھا جس کی بالواسطہ ذمہ داری خود اس پر بھی عائد ہوتی تھی۔ کربے میں موت جیسی خاموش طاری تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ماتھے پر آیا ندامت کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھتے ہوئے بولا۔ ”بانو! اتنا کچھ سننے کے بعد مجھے سمجھ نہیں آتی اپنی صفائی میں کیا کموں۔ شاید تم لوگوں کا اصل مجرم میں ہی ہوں۔ نہ میں ظفر کو ساتھ لے جاتا نہ یہ قیامت تمہارے گھرانے پر ٹوٹی۔“

وہ متوازن لہجے میں بولی۔ ”نہیں! یہ بات نہیں۔ تم خواہ مخواہ خود کو کوس رہے ہو۔ ہونی ہو کر رہتی ہے، البتہ اب اگر تم چاہو تو اپنے ذمے کبھی قرض چکا سکتے ہو۔“

مراد نے کسی قدر حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”بانو! تم کتنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر بتاؤ۔ میں اگر اس گھرانے کے کسی کام آسکا تو شاید میرے ضمیر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔“

بانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”جس روز میری ماں مری تھی، اس کی میت کے سرہانے بیٹھ کر میں نے دو عہد کئے تھے۔ ایک چھوٹی بہنوں کو ماں بن کر پالنے اور ان کی کفالت اور حفاظت کا عہد اور دوسرا اپنے بھائی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا حلف۔ میں پہلی ذمہ داری تو نبھا چکی ہوں۔ میں نے ان تینوں کو اپنی بچیوں کی طرح ہر

ہست سے حساب چکانے ہیں۔“

یہ سن کر بانو کے چہرے پہ رونق سی آگئی تھی۔ سمجھی ملازمہ ہلکی سی دستک کے بعد اندر داخل ہوئی۔ ”بانو بیگم! اندھیرا چھا گیا ہے اور آپ نے ابھی تک بی نہیں جلائی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے روشنی کا بیٹن آن کر دیا اور پھر بانو کی جانب مڑ کر کہا۔ ”آپ کہیں تو کھانا لگا دوں؟“

بانو بولی۔ ”نہیں، فی الحال تو چائے وغیرہ ہی لے آؤ۔ کھانا دیر سے کھائیں گے۔“ اس کے بعد اس نے اپنی تینوں بہنوں کو فون پر پیغام دیا کہ وہ اگلے روز اس کے یہاں آئیں۔

اور دوسرے دن دوسرے دن وہ تینوں اپنے ننھے سنے بچوں سمیت موجود تھیں۔ گھر میں خاصی چہل چل تھی۔ وہ سبھی مراد کو پہلے سے جانتی تھیں، لہذا خاصی اپنائیت سے ملیں اور شام کو لوٹ گئیں۔ مراد یا بانو نے ان میں سے کسی کو بھی اپنے آئندہ ارادوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

مراد نے ٹھنڈے ذائقے سے جب اس مسئلے پر غور کیا تو اسے نور بانو کا بھارت جانا کچھ مناسب معلوم نہ ہوا، لہذا اس نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ پیشکش کی کہ وہ تنہا ہی یہ مشن کامیاب بنانے کی کوشش کر سکتا ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی اور مراد کی ایک نہ چلی۔

تب مراد نے جیل کے کئی پرانے دوستوں سے رابطہ کیا اور ان سے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور تیاریوں میں لگ گیا۔ بانو مالی لحاظ سے کافی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی تمام جمع پونجی اس کے سامنے ڈھیر کر دی تھی۔ اس نے اس رقم کے عوض چند سنگٹروں سے بھارتی کرنسی حاصل کی اور تمام تیاری مکمل ہونے کے بعد بانو کو اطلاع دی کہ اب ہم بھارت میں داخل ہونے کی پوزیشن میں ہیں۔

اس مرحلے پر اس نے آخری کوشش کے طور پر بانو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ شام

آفت سے بچا کر ان کے گھروں کو روانہ کر دیا ہے جہاں وہ سبھی خوش و خرم زندگی بتا رہی ہیں۔ اب مجھے اپنے ماں جائے کے خون کا حساب لینا ہے اور صرف ایک بار اس کی قبر پر جا کر آنسوؤں کے چند قطرے بہانے ہیں۔ ممکن ہے تمہارے نزدیک یہ بڑی فضول اور احمقانہ خواہش ہو، لیکن میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے، ورنہ تو اب اس بیسواکی میں جینے کی آرزو کس کو ہے؟“

مراد اس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا جو کام اسے کرنا چاہئے اس کی بابت ایک کنزور سی عورت سوچ رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ خونی رشتے شاید واقعی انوث ہوتے ہیں اور یہ دوستی وغیرہ محض کتابی باتیں ہیں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ انجانے خیالوں میں کھو گیا۔

بانو کافی دیر تک اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی، پھر دھیمے لہجے میں اس نے کہا۔ ”تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے میں نے ایسے ہی تم سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ تم تو پہلے ہی خدا خدا کر کے ان کی قید سے رہا ہو کر آئے ہو۔ بھلا تم واپس کیوں جانے لگے؟“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

مراد نے اسے غصے سے گھورا اور جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ لفظ چباتے ہوئے بولی۔ ”میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ تمہیں خود واپس بھارت نہیں جانا چاہئے، البتہ ہو سکے تو مجھے ان لوگوں کی تفصیل سے آگاہ کر دو جو میرے بھائی کی موت کے اصل ذمے دار ہیں۔ باقی مسائل میں خود ہی حل کرنے کی کوشش کروں گی۔“

مراد کی تیاریوں پر ہل پڑ گئے تھے۔ وہ قدرے ساؤکھا کھا بولا۔ ”نور بانو! تم اب میری توجہ نہ کر رہی ہو۔ یہ درست ہے کہ ظفر تمہارا بھائی تھا، مگر میں ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا کہ تمہیں وہاں اکیلا بھیج دوں۔ ویسے بھی اب یہاں میرے لئے کون سی دلچسپی باقی بچی ہے۔ یہاں رہوں گا تو ذمہ ہمیشہ ہرے رہیں گے۔ وقت بھی ان پر مرہم نہیں رکھ پائے گا۔ لہذا اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ بھارت چلوں گا۔ مجھے بھی وہاں

کی چائے کے دوران وہ آہستگی سے بولا۔ ”دیکھو“ میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ وہاں جانا تمہارے لئے مناسب ہے نہ ضروری۔ یہ کام میں اکیلا بھی کر سکتا ہوں، لہذا.....“ وہ اس کی بات سچ میں کانٹے ہوئے بولی۔ ”مراد! میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کی گنجائش نہیں۔ رہا عورت ذات ہونے کا سوال تو یہ خطرات تو ان شریف زادیوں کے لئے ہوتے ہیں جو واقعی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں تو جس راستے پر چل رہی ہوں وہ عورت کے نام پر ایک دعبہ ہے۔ میں چاہوں بھی تو معاشرتی سطح پر مجھے اب وہ احترام میسر نہیں آسکتا جو ایک شریف عورت کا مقدر ہوتا ہے، لہذا جو نہیں مل سکتا اس کی خواہش ہی فضول ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو، وہاں میں تمہارے لئے مسئلہ نہیں بنوں گی بلکہ ممکن ہے میری موجودگی سے تمہارے لئے کچھ آسانیاں فراہم ہو جائیں کیونکہ ہمیں علم ہی ہے کہ بعض حالات میں ایک عورت وہ کام کر ڈالتی ہے جو سو مرد بھی مل کر نہیں کر سکتے۔“

مراد ابھی تک شش و پنج کا شکار تھا، لیکن بانو کے ارادے کی مضبوطی دیکھ کر مزید کچھ نہ بولا اور سفر کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

یکم اور دو جون ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب ان دونوں نے ایک اسمگلر کی مدد سے بین الاقوامی سرحد عبور کی اور بھارت میں داخل ہو گئے۔ ان کا گائیڈ برکت ساری عمر اسی سرحد کے آریار چھوٹی موٹی اسمگلنگ کرتا رہا تھا، لہذا اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے انہیں جے پور پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ بھارت میں داخل ہونے کے بعد کرن پور سے وہ ایک پرانے سے ٹرک میں سوار ہوئے جسے برکت کا بااعتماد ساتھی شام سنگھ چلا رہا تھا۔

اگلی صبح نوبے وہ سب جے پور میں چاند پول گیٹ کے باہر واقع محلہ پاتریاں کے چھوٹے سے مکان میں بیٹھے تھے جس کا انتظام شام سنگھ نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ مالک مکان کو ایک سال کا بیٹگی کرایہ ادا کیا جا چکا تھا۔ انہیں وہاں چھوڑ کر برکت اور شام سنگھ

روانہ ہو گئے۔

یہ گھرتین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے خوابگاہ کے طور پر ایک ڈرائنگ روم کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا اسٹور اور کچن تھے، البتہ صحن غنقا تھا۔ چھت پر چاروں جانب پانچ فٹ اونچی دیواریں تھیں، لہذا چھت ہی کو صحن کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

وہ دن انہوں نے گھر ہی میں گزارا تھا۔ شام سنگھ نے استعمال کی تمام چیزیں پہلے ہی بہم پہنچا دی تھیں۔ اگلی صبح بانو نے ناشتہ تیار کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ کچن میں داخل ہوئی تھی، لہذا اس کے احساسات عجیب سے تھے۔ ناشتے کے بعد چائے پیتے ہوئے وہ مستقبل کی منصوبہ بندی میں مشغول ہو گئے۔

چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بانو بولی۔ ”ہم لوگ یہاں تک تو بحفاظت پہنچ گئے ہیں، مگر اب اس جیل سپرنٹنڈنٹ دیوی پر شاد تپانچی کو کیسے ڈھونڈیں گے؟“

مراد نے حسب عادت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے تپانچی کا پتہ چلانا زیادہ مشکل کام نہیں ہو گا۔ ظاہر ہے وہ راجستھان کی کسی جیل میں اب بھی سپرنٹنڈنٹ کے طور پر کام کر رہا ہو گا، لیکن پہلے ہمیں گھوم پھر کر جے پور اور گردونواح میں مکمل آگاہی حاصل کرنی پڑے گی تاکہ کسی مشکل صورت حال میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکل کھڑے ہوئے۔

وہ سڑک پر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک سائیکل رکشہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”پرنام شرمیمان جی! آئیں رکشے میں بیٹھیں۔ آپ کو اس گلابی گمری کی سیر کراؤں۔“ مراد نے چند لمحوں کے اندر ڈرائیور کا جائزہ لیا پھر بانو کو اس میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی کسرتی جسم کے مالک ادھیڑ عمر ڈرائیور نے رکشہ آگے بڑھا دیا۔

تھوڑا آگے جا کر وہ بولا۔ ”مسار! کجاں چلوں؟“

مراد نے کہا۔ ”یار! ہم تو یہاں اجنبی ہیں۔ جے پور کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ

بہاری مرضی ہے کہ شروع کہاں سے کرتے ہو۔

یہ سن کر ڈرائیور کی ہاتھیں کھل گئی تھیں۔ ”سرکار! میرا نام سیوا رام ہے اور دوسروں کی سیوا ہی میرا دھرم ہے۔ آپ بالکل چٹانہ کریں۔ آپ کو یہاں کی بھرپور سیر کراؤں گا۔ میں ہوں تو سائیکل رکشہ کا ڈرائیور مگر جے پور کے بارے میں میری معلومات نورازم دھماک (جھکے) کے گاؤں سے زیادہ ہیں۔“

مراد اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان رکشے کی رفتار سے بھی تیز چل رہی تھی۔ ”شریمان جی! آپ کو پتہ ہے کہ جے پور کو گلابی شہریوں کہا جاتا ہے؟“ مراد نے نفی میں سر ہلا دیا تو سیوا رام فوراً اشارت ہو گیا۔ ”آج سے تقریباً نوے سال پہلے پورے شہر کو گلابی رنگ میں رنگا گیا تھا۔ ہر چھوٹی بڑی عمارت کو اس لئے یہ رنگ دیا گیا تھا کہ ان دنوں برطانوی ولی عہد ہندوستان کے دورے پر آیا تھا اور اسے جے پور بھی آنا تھا۔ راجہ نے ولی عہد بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوئی انوکھا کام کرنے کا سوچا لہذا ہر چیز پر گلابی رنگ پھیر دیا گیا۔ ولی عہد یہاں آکر بڑا متاثر ہوا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بنک سٹی آف انڈیا!“ تبھی سے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ برصغیر کے عظیم ترین صحرا کے ایک گوشے میں واقع اس شہر کو ”گیت دے آف راجستھان“ بھی کہا جاتا ہے۔“

سیوا رام رکشہ کھینچے ہوئے ہاتھ شاعری پر اتر آیا تھا۔ ”یہ دھرتی راجپوت بہادروں کی سرزمین ہے۔ اس کی وجہ شہرت شاہی محل اور خوبصورت رنگوں سے مزین بازار ہی نہیں بلکہ اس کا اصل حسن آپ اب بھی چاروں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ وہ سانسے جاتیں سندھ اور دراز قدر مارواڑی عورتیں جن کی چولیوں اور گھاکھروں نے سورگ کا منظر زمین ہی پر پیدا کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور چاندی کے زیورات، سڑکوں پر چلتی ڈونٹ گاڑیاں ماضی اور حال کے حسن امتزاج کا شاہکار ہیں۔“

بانو اگرچہ خاموش بیٹھی تھی مگر اس کی باتوں میں کافی دلچسپی لے رہی تھی۔

”سیوا رام جی! آپ تو بڑے دانشور قسم کے آدمی ہیں۔“ اپنی تعریف سن کر سیوا رام نے سینہ پھیلا کر دوبارہ نثر میں شاعری شروع کر دی۔ ”شری متی جی! ابھی تو میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ مجھے تو لوگ راجستھان کا انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں۔ بہر حال میں آپ کو جے پور کی بابت بتا رہا تھا۔ موجودہ شہر محض ۱۶۱۰ سال پرانا ہے۔ مہاراجہ جے سنگھ نے اسے اپنے نام پر بنایا تھا۔ وہ خود تو پہاڑی پر واقع امبر فورٹ میں رہتا تھا۔

”راجہ نے اپنے لئے جنت ہنتر کی طلسماتی عمارت بنوائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ سانسے نیوا محل کی پر شکوہ عمارت ہے۔ دیے بھی کبھی یہ باقاعدہ محل نہیں رہا۔ لفظ ایک بار شاہی گھرانے کی خواتین نے یہاں کھڑے ہو کر کسی جلوس کا نظارہ کیا تھا اور اس کے ساتھ دلی عمارت راجستھان کی صوبائی اسمبلی کی بلڈنگ ہے۔“ مراد اس کی چرب زبانی سے کسی قدر اکتا کر بولا۔ ”یار سیوا رام! باقی معلومات پھر کبھی بتا رہا۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ فی الحال کہیں رک کر کھانا کھاتے ہیں۔“

انہوں نے دہرے کا کھانا ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کھایا۔ اس دوران سیوا رام باہر کھڑا رہا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کھانے کے لئے کہا بھی تھا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ ”سرکار! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں۔ میں ہریجن ہوں۔ اگر ہوٹل والوں کو پتہ چل گیا کہ ایک اچھوت بھی ہوٹل کے اندر کھانا کھا رہا ہے تو میرے ساتھ آپ کی بھی شامت آجائے گی۔“

کھانے سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلے تو وہ پھر ان کی سیوا کے لئے حاضر تھا۔ انہیں لے کر ایک وسیع و عریض باغ میں واقع محل میں داخل ہوتے ہی اپنی قابلیت بگھارنے لگا۔ ”شری متی جی! یہ سٹی ہیلیس ہے۔ یہ محل اور راجستھانی طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے اندر موجود آرٹ گیلری میں چاندی کے برتنوں کا دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ جب بھی جے پور کے مہاراجہ برطانیہ وغیرہ کے سفر پر جاتے تھے تو ان کے لئے دریائے گنگا کا پانی یعنی گنگا جل انہی برتنوں میں بھر کر ان کے ساتھ لے جایا جاتا تھا۔“

من اردو ڈاٹ کام

☆ 60 جے پور کے پوتر پانی

مراد اور بانو آج کی سیر سے کافی لطف اندوز ہوئے تھے۔ ان کے تے ہوئے اعضاء قدرے پرسکون ہو گئے تھے۔

اس کے بعد سیوارام نے انیس چاند پول گیٹ اتارا تو مراد نے اسے سوکانوٹ تھمایا جسے دیکھ کر اس کی باپھیں کھل گئی تھیں۔ ”ممداراج! میں کل صبح پھر آؤں گا تاکہ گھوٹنے میں آپ کو کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ مراد نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے روانہ ہونے کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔

اگلے چند روز بھی اسی طرح گزارے۔ شام کے کھانے کے بعد بانو بولی۔ ”مراد! ہمیں یہاں آئے پندرہ روز ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہم اصل مقصد کی جانب ایک انچ بھی نہیں بڑھے۔“ مراد اس کی جانب دیکھتے ہوئے پر خیال لمبے میں بولا۔ ”کہہ تو تم صحیح رہی ہو مگر یہاں حفاظت سے بچ کر محفوظ قیام کا بندوبست کر لینا بھی اہم کامیابی ہے اور ہم یہ بنیادی مرحلہ طے کر چکے ہیں۔ رہا آگے کا مسئلہ تو یقیناً اس میں بھی پیش رفت ہوگی۔ ویسے تمہارے خیال میں یہ سیوارام کیسا آدمی ہے۔“

بانو بولی۔ ”بظاہر تو خاصا بھلا آدمی ہے۔ چہرے ہرے سے بھی کافی معصومیت جھلکتی ہے۔ مگر اصل انسان تو چہروں کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی کے بارے میں بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ویسے تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟“

مراد کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔ ہمیں ایک آدھ بھروسے کے آدمی کی ضرورت تو پڑے گی۔ بہر حال میں کل سیوارام کے ذریعے تریپاشی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

سیوارام کی کارکردگی پہلے ہی روز بری نہیں رہی تھی۔ اس نے آئی جی جیل خانہ جات کے کلرک سے دوستی کاٹھ لی تھی اور واپس آکر بتایا تھا کہ تریپاشی ڈیڑھ سال قبل ریٹائر ہو چکا ہے۔ اس نے یہ ریٹائرمنٹ قبل از وقت لے لی تھی۔ وہ رہنے والا تو بیکانیر کا ہے مگر ریٹائر ہونے کے بعد اس نے محلے سے کوئی رابطہ نہیں رکھا اور وہ لاپتہ ہو گیا ہے۔

☆ 61 جے پور کے پوتر پانی

جس کی وجہ سے محکمہ اسے پنشن بھی نہیں دے رہا۔ چند ایک بار اس کے ایڈریس پر یاد دہانی کے نوٹس بھجوائے گئے تھے مگر یہ نہ چلا کہ اس جنگلے کودہ کلنی عرصہ پہلے فردخت کر چکا ہے۔ لہذا کسی نے محکمہ نوٹس وصول نہیں کیے۔

یہ اطلاع مراد کے لیے یقیناً حوصلہ افزا نہیں تھی، مگر وہ اتنی جلدی حوصلہ کیسے ہار بیٹھتے؟ اس لیے سیوارام کو کچھ رقم دے کر شکریے کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔

۱۹۷۹ء میں پورے شمالی ہند میں گرمی کچھ معمول سے زیادہ ہی پڑی تھی۔ دیگر علاقوں کی طرح جے پور کے لوگ بھی آسمان کی جانب پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا بارش کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ مگر بادلوں نے گویا نہ برسنے کی قسم کھالی تھی۔ حالانکہ عام حالات میں جے پور میں موسم گرما زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ دس اپریل سے ۲۰ مئی تک محض چالیس روز ہی گرمی کی شدت رہتی ہے۔ اس کے بعد بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اگست کے آخر تک جاری رہتا ہے۔

اتوار کی سہ پہر مراد اور بانو نے ایم آئی روڈ پر واقع چھوٹے سے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہی آسمان پر ہلکے سے بادل چھا گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا آسمان بادلوں سے یوں ڈھکا کہ دن پر رات کا گماں ہونے لگا۔ ہوا میں موجود نمی اس بات کا اظہار تھی کہ قریب ہی لمبیں بارش ہو رہی ہے۔ موسم کے اس سہانے پن کا لطف لینے کے لیے اکثر لوگ چھتوں یا سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

وہ دونوں بھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہوٹل قادی کی نیت سے ہوٹل سے نکلے اور باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ مراد نے گزشتہ چند ماہ سے داڑھی بڑھالی تھی تاکہ سر سری نظر میں کوئی شخص یہ اندازہ نہ کر سکے کہ چند ماہ پہلے وہ بھارتی جیلوں میں قید کائنات والا مراد ہے۔ اس شکل میں وہ کلنی باوقار لگ رہا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ سے دونوں اکٹھے رہ رہے تھے۔ مگر ان کے درمیان باہمی احترام کے احساسات نے خود بخود نظر نہ آنے والی حیدر فاصل برقرار رکھی تھی اور دونوں ہی اسے قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس

وجہ سے بدگمانی کسی کے بھی ذہن میں جگہ نہ پاسکی تھی۔

اس وقت پیدل گھومنے سے مراد کا مقصد محض تفریح نہیں تھا بلکہ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ان کی نگرانی تو نہیں کی جارہی۔ کچھ دور جا کر وہ مطمئن سے لہجے میں بولا۔ ”سنا تھا کہ جے پور میں بھارتی خفیہ اداروں نے نظرنہ آنے والا ایک جال سا بن رکھا ہے، مگر خدا کا شکر ہے ہم لوگ ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آئے۔“ بانو دھیرے سے بولی۔ ”مگر اس بات کا اندیشہ تو بہر حال موجود ہے۔ لہذا ہمیں کچھ تیز ہونا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ اڑنے سے پہلے ہی دھریلے جائیں۔“

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے۔ موسم اب بھی خوشگوار تھا۔ اچانک ہی ہلکی سی پھوار پڑنے لگی تھی۔ بانو بولی۔ ”میرا خیال ہے کوئی سواری لے کر ہمیں واپس گھر چلنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ بارش میں گھر جائیں۔“ مراد نے بھی قدرے تشویش سے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی اور رک کر ٹیکسی یا رکشہ ڈھونڈنے لگا۔ اسی دوران بارش کی تیز بوندیں گرنے لگیں مگر دور تک کوئی خالی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔

یہ صورت حال دیکھ کر وہ بولا۔ ”ایسے تو ہم بالکل بھیگ جائیں گے۔ وہ سامنے غالباً کوئی ریٹورنٹ ہے۔ آؤنی اٹال دہیں بیٹھ کر بارش سے بچیں۔“ بانو کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ساتھ چلتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ یہ درمیانے درجے کا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ ہال کے آخری سرے پر چند فیملی کیمین بھی موجود تھے۔

وہ دونوں کچھ تیزی سے چلتے ہوئے کیمینوں کی جانب بڑھے۔ پہلے چھ کیمین تو خالی نہ تھے البتہ آخری سات نمبر کیمین میں انہیں جگہ میسر آگئی۔ بارش میں شدت آجانے کی وجہ سے بہت سے اور لوگ بھی ریٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر میں ہال بھی تقریباً بھر گیا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر استقبال پر موجود لڑکی اور ویٹروں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عام حالات میں یہ ہوٹل گاہکوں کی زیادہ توجہ حاصل نہیں کرتا۔

ادھیڑ عمر کے ایک ویٹرنے آکر ان کی میز پر کپڑا پھیرا اور سر کو ہلکے سے خم دیتے ہوئے بولا۔ ”مہاراج! آپ کیا پسند کریں گے؟“ مراد نے استغماہی نظریں بانو کی جانب اٹھائیں تو وہ بولی۔ ”نی اٹال تو کافی لے آؤ۔ بعد میں دیکھیں گے کیا کھانا ہے۔“ تھوڑی دیر بعد کافی سرد ہو گئی تھی۔ بظاہر عمارت جتنی صاف ستھری نظر آتی تھی برتن اس سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مگر انہیں اس سے کوئی خاص غرض نہ تھی۔

وہ دونوں کافی پیٹے ہوئے ہال کے بیرونی شیشوں سے موسلا دھار بارش کو دیکھتے رہے۔ اس مقصد کے لیے مراد نے سامنے موجود پردے کو ایک طرف کھسکایا تھا۔ تھوڑی دیر میں موسلا دھار بارش کی وجہ سے سڑک کسی جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی۔

تجربی ہال کا بیرونی دروازہ تیزی سے کھلا اور اکبرے بدن کا ایک دبلا پتلا شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ استقبال کے قریب رک کر غالباً کسی میز کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ خلی نشست نہ پا کر وہ کیمینوں کی قطار کی جانب بڑھا اور پردے ہٹا کر ان کے اندر جھانکنے لگا۔ یہ حرکت مراد سمیت تبھی کو ناگوار گزری تھی۔

ابتدائی کیمینوں میں دو سے زیادہ افراد موجود پا کر نوادر کی نگاہوں میں مایوسی کے سائے گرے ہوئے گئے۔ اس دوران وہ کچھ خوفزدہ سی نظروں سے ہوٹل کے بیرونی دروازے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ مراد کے کیمین میں جلدی سے داخل ہوا اور ”ایکسیوزی“ کہتا ہوا مراد کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے مراد اور بانو نے بری طرح ناؤ کھایا تھا۔ ان دونوں کی تیوریاں پڑھ گئی تھیں۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کسی رد عمل کا اظہار کرتے ہوٹل کا بیرونی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ دوبارہ کھلا اور چار ہٹے کئے افراد اندر داخل ہوئے۔ وہ شکل ہی سے چھپے ہوئے بد معاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے متلاشی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا اور پھر غالباً اپنے مطلوبہ شخص کو نہ پا کر کیمینوں کی جانب بڑھے۔

اس دوران مراد کی نگاہیں بے ساختہ انداز میں اپنے ساتھ اجنبی نوجوان کی جانب

اٹھ گئیں جس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے سامنے موجود پردہ کھینچ کر برابر کر دیا تاکہ باہر سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے مگر اس حرکت پر جھنجھلا کر بانو نے پردہ دوبارہ ہٹا دیا تھا۔

چاروں غنڈے ہر کیمین کا پردہ ہٹا کر اندر بھاگتے ہوئے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر موجود جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ آخری کیمین کے سامنے پہنچے تو ان کی آنکھوں میں چمک اٹھی تھی۔ سب سے آگے والے پستہ قد نے کیمین کا پردہ پوری طرح ہٹا دیا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ان تینوں کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ جس کے ساتھ ہی مراد اور بانو کے چہروں کی رنگت از گئی تھی، مگر پھر دونوں نے خود کو سنبھالا۔

مراد مضبوط لمبے میں بولا۔ ”مسٹر! یہ کیا حرکت ہے۔ تمہیں علم نہیں کہ ہر بات کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔“ یہ سن کر پستہ قد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”واہ بھی واہ! تو تم اب ہمیں آداب سکھاؤ گے۔ اسے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔“ مراد حیران سا ہو کر بولا۔ ”تم کہا کیا چاہتے ہو؟ ہم نے آخر تمہاری کون سی چیز چرائی ہے؟“

پستہ قامت شخص اپنی خیالی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے مجرم کو اپنے پاس چھپا رکھا ہے۔ اوپر سے پوچھتے ہو کیا چرایا ہے؟“ مراد اچانک کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو میرا پرانا دوست ہے۔ یہ کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

یہ سن کر وہ جھٹکے قد کا شیطان اپنی ایک آنکھ دہاتے ہوئے بولا۔ ”ارے بھی شکر اور شہجو! سناتم نے یہ شیطان جی بھی اس حرامی راجیو کے ساتھی ہیں۔ چلو اچھا ہے انہیں بھی اپنے ساتھ لئے چلتے ہیں۔“ یہ صورت حال دیکھ کر بانو نے گڑبڑا کر مراد کی جانب دیکھا اور پھر پست قامت کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر! میرے ساتھی غلط کہہ رہے

ہیں۔ دراصل ہمارا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ بد معاش بانو کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ارے دیوی جی! آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔ چنا مت کریں! آپ تو دیوی ہیں اور ان کی صرف پوجا کی جاتی ہے۔ آپ کو کسی کشت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

مراد کے ساتھ بیٹھا شخص جسے پست قامت نے راجیو کے نام سے مخاطب کیا تھا، دھیمی سی آواز میں بولا۔ ”بدری ناتھ! یہ عورت صحیح کہہ رہی ہے۔ واقعی میرا ان لوگوں سے کوئی سمبندھ (تعلق) نہیں۔ میں تو تم سے چھپنے کے لئے زبردستی یہاں آ بیٹھا تھا۔“ یہ سن کر بدری ناتھ نے ہلکا سے قہقہہ لگایا۔ ”تم تینوں کے بیان ہی ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ لہذا راج جھوٹ کا فیصلہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ تم تینوں کو ”آشرم“ چلنا پڑے گا۔“ یہ سن کر راجیو نے قدرے جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ ”یہ تم لوگوں کی خام خیالی ہے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں۔“

بدری ناتھ غصے میں تیج رتاب کھاتے ہوئے آگے بڑھا اور راجیو کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔ مراد اچانک اٹھا اور اس نے بدری کا ہاتھ پکڑ کر اسے بری طرح جھٹک دیا۔ ”یہ کیا بد معاشی ہے۔ اگر تمہیں اس شخص کے خلاف کوئی شکایت ہے تو جا کر پولیس کو اطلاع دو۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے تم کون ہوتے ہو۔“

بدری اپنی توہین پر تاؤ کھاتے ہوئے بولا۔ ”تم درمیان میں ٹانگ اڑا کر اپنے لئے مصیبت مول لے رہے ہو۔“ پھر وہ اچانک بانو کی جانب مڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”شریستی جی! اپنے پتی کو سمجھائیں کہ خواہ مخواہ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ یہ تو خیر مرے گا ہی اور آپ بھی ہمیشہ کے لئے دودا (بیوہ) ہو جائیں گی۔“

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ اسے مراد پر غصہ آ رہا تھا۔ غصے پر قابو نہ پاسکی تو تیز آواز میں بولی۔ ”یہ تم پر اے پھدے میں کیوں ٹانگ اڑا رہے ہو۔ بے موقع دلیری حماقت کا دوسرا نام ہے۔“

مراد اسی صحت سے بولا۔ ”تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں نے ساری عمر قانون کا پالن (عمل درآمد) کیا ہے۔ اس لئے اپنے سامنے ٹالفاصلی برداشت نہیں کر سکتا۔“

پھر وہ بدری ناتھ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید تمہیں میرے بارے میں علم نہیں۔ سی بی آئی کے مقامی ایس پی رام سرپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میں خود ”بھارت ٹائمز“ کا بیورو چیف ہوں۔ میری ایک فون کال پر سارے جے پور کی پولیس ابھی یہاں پہنچ جائے گی۔ لہذا بہتری اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ اپنے انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔“

بانو اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کا دماغ جل گیا ہو۔ وہ حیران تھی کہ یہ شخص کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بول رہا ہے مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی تھی۔ بدری ناتھ گوگو کا شکار ہو چکا تھا۔ کیونکہ یہ صورت حال اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے گھوم کر اپنے ساتھی شکر اور شبھو کی جانب مشورہ طلب انداز سے دیکھا۔

شکر اس کا مطلب سمجھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ”بدری ناتھ جی! میرے دھار میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوای جی سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ رہا راجیو کا بچہ تو اس کی ساتھی تو ہمارے قبضے میں ہے ہی۔ اگر اس دو لکے کے صحافی نے کوئی چالاکی دکھائی تو اسے ہسپتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

بدری ناتھ بھی اس کی رائے سے متفق نظر آتا تھا۔ ان چاروں نے قرآلود نگاہیں مراد پر ڈالیں اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ ہال میں موجود اکثر افراد یہ تماشا دیکھ رہے تھے مگر کسی نے مداخلت کی ہمت نہیں کی۔ البتہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

راجیو ممنون نگاہیں مراد پر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”شریمان جی! مجھے آپ کا نام تو معلوم نہیں مگر آپ نے اس وقت میری جو مدد کی ہے اس کے لئے جیون بھرا احسان مند رہوں گا۔ ویسے اب بہتری اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے نکل چلیں اگر انہیں حقیقت حال کا

علم ہو گیا تو میرے ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں۔“

مراد کسی قدر تمکنت بھرے انداز میں بولا۔ ”فکر مت کرو۔ ویسے حقیقت حال سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ راجیو کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”اصل میں مجھے سی بی آئی کے ایس پی رام سرپ کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ یقیناً آپ نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کا تعلق ”بھارت ٹائمز“ سے نہیں کیونکہ میں خود صحافی ہوں۔ لہذا جب انہیں غلطی کا احساس ہو گا تو فوراً لوٹ کر آئیں گے اور پھر.....“

مراد اس کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ ”مگر یہ کم بخت کون تھے اور تمہارا ان سے کیا جھگڑا ہے؟“

راجیو بولا۔ ”اپنے جھگڑے کی بات تو بعد میں بتاؤں گا۔ مگر یہ سبھی ”پوتر پالی“ گروہ کے لوگ تھے۔“ مراد کے ساتھ بانو بھی حیران سی رہ گئی تھی۔

”یار راجیو! یہ پوتر پالی کس چڑیا کا نام ہے؟“ اب راجیو کی آنکھوں میں شکوک کے سائے لہرانے لگے تھے۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا تعلق جے پور سے نہیں ورنہ یہاں کا تو بچہ بچہ اس نام سے واقف ہے۔“

ابھی مراد نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ بانو کی نظریں ہوٹل کے داخلی دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ آٹھ دس مسلح اور ہاروری پولیس واسلے ایک انسپکٹر کی قیادت میں اندر داخل ہوئے تھے اور بغیر رکے خود ان ہی کی جانب بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مراد کے چہرے پر اچانک تشویش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

پولیس والوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر مراد اور بانو چند لمحوں کے لئے بری طرح ڈگمگا گئے تھے۔ بانو ہراساں لمبے میں بولی۔ ”دیکھ لیا خواہ مخواہ ہمداری دکھانے کا نتیجہ۔“ مراد کے جواب دینے سے پہلے ہی پولیس انسپریز چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ نسبتاً ٹھنکے سے قد کا بد صورت انسپکٹر کیبن کے دروازے میں کھڑا ہو کر ان کی جانب یوں

ساتھی تو شکل ہی سے پانی بلکہ پرانے پانی لگتے ہیں۔“

بانو اپنی نشست سے اٹھی اور دل موہ لینے والے انداز سے انسپکٹر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”آفسرو! کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ محض ایک گناہ کال کی وجہ سے آپ ہماری توہین کرنا چاہتے ہیں۔“

انسپکٹر بڑبڑایا۔ ”دیوی جی! آپ کتنی ہیں تو میں مان لیتا ہوں کیونکہ میں نے آج تک کسی ناری خصوصاً سندرناری کا دل نہیں توڑا، حالانکہ سندرناریوں کا سلوک بھی میرے ساتھ مثالی نہیں رہا۔“

بانو نے بھی آداب بجالانے والے انداز میں کہہ۔ ”مہاراج! آپ تو اس بھگ کے کرشن بھگوان ہیں۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دیں۔ کسی روز آپ کی یہ داسی سیوا کے لئے حاضر ہوگی۔“ انسپکٹر مہاراج کچھ دیر اس کی جانب یوں دیکھتا رہا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ وہ سچ بول رہی ہے یا اس پر طنز کر رہی ہے۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے جیب سے وزمننگ کارڈ نکالا اور بانو کو تھما دیا۔ پھر سپاہیوں کی جانب مڑتے ہوئے کہہ۔ ”چلو واپس اور آئندہ سے فون پر آبرویشن لگا کر رکھنا تاکہ کوئی بد معاش غلط اطلاع دینے کے بعد بچ کر نہ جاسکے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

ان کو باہر جاتے دیکھ کر مراد کی جان میں جان آئی اور اس نے قدرے حیرت سے کہہ۔ ”اس وقت تم نے کمال ہی کر دیا۔“ بانو سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”میرے کمال سے زیادہ اس پولیس والے کے حد سے بڑھے ہوئے گھامڑین کا دخل ہے، بہر حال اب جلد یہاں سے کھٹکنے کی تیاری کرو۔ ضروری نہیں دوبارہ بھی ایسا گدھا پولیس افسر آئے۔“

مٹی ادا کرنے بعد وہ تینوں باہر نکلے اور کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد جب مطمئن ہو گئے کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر چاند پول گیٹ کے باہر اپنے مکان پر پہنچے۔ اس واقعے نے بھی کے اعصاب متاثر کئے تھے۔ ذرا تنگ روم میں انہیں بٹھا کر بانو چائے بنانے لگیں۔

گھورنے لگا جیسے لگا ہوں ہی سے ان کی نیت جان لیتا چاہتا ہو۔

مراد نے خود کو سنبھالتے ہوئے خشک لہجے میں کہہ۔ ”آفسرو! یہ کیا حرکت ہے۔ آپ بلاوجہ ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ انسپکٹر اس کی خود اعتمادی سے کسی قدر مرعوب ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے آپ کی نجی گفتگو میں مداخلت کر رہا ہوں مگر آپ سب کو تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہو گا۔“

مراد اکھڑے لہجے میں بولا۔ ”مگر کیوں؟ آخر ہم آپ کے ساتھ کیوں جائیں؟ ہم نے کونسا پرادہ (گناہ) کیا ہے؟“

انسپکٹر بھی افسرانہ موڈ میں آگیا تھا۔ ”یہ تو آپ کو وہیں جا کر پتہ چلے گا۔ دیے ایک بات کا دھیان رکھیں۔ ہم آپ کی انکوائری کے لئے آئے ہیں۔ آپ نے الزام سے سوالات پوچھنا شروع کر دیے ہیں۔ یہ بات آپ کو منگی بھی پڑ سکتی ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلیں، ورنہ ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔“

اس مرحلے پر بانو نے دخل اندازی کرتے ہوئے نرم آواز میں کہہ۔ ”مگر آفسرو! ہمیں پتہ تو چلنا چاہئے کہ ہمیں کس جرم میں شامل تفتیش کیا جا رہا ہے۔“ انسپکٹر نے اس کی بات سے زیادہ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”شری مستی جی! تھوڑی دیر پہلے کسی گناہ محض نے ہمیں فون پر اطلاع دی ہے کہ اس ہوٹل کے سات نمبر کیمین میں موجود ”پوتر پانی“ گروہ کے تین افراد کسی جرم کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں، لہذا ہم اس سلسلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

یہ سن کر بانو کے ذہن نے یک دم پلٹا کھلیا اور وہ کسی فیصلے پر پہنچتی ہوئی اپنائیت بھرے انداز میں انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”معزز آفسرو! آپ اتنے ذہین اور تجربہ کار افسر ہیں، یہ بتائیں کہ ہم لوگ چروں سے پوتر لگتے ہیں یا پانی؟“

انسپکٹر نے محبت آمیز لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ۔ ”کماری جی! سچی بات تو یہ ہے کہ میرا دل کہتا ہے کہ آپ تو سو فیصد پوتر ہیں، البتہ آپ کے یہ دونوں

اس کے جانے کے بعد بھی کمرے میں خاصی دیر خاموشی طاری رہی۔ مراد نے راجیو کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہل۔ ”مسٹر راجیو! اب ذرا تفصیل سے بتائیں کہ آپ کا ان لوگوں سے کیا جھگڑا ہے اور یہ لوگ تھے کون؟“

راجیو کچھ دیر ذہن میں الفاظ ترتیب دینے کے بعد آہستگی سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کو یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں منجای اخبار ”راجستان پرنکا“ میں کرائم رپورٹر کے طور پر کام کر رہا ہوں اور ان کا تعلق ”پوتر پالی آف پنک شی“ نامی گروہ سے ہے۔ یہ گروہ گذشتہ ڈیڑھ دو سال سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کا ذکر پچھلے کچھ عرصے سے اخبارات اور جرائم کے حلقوں میں تسلسل کے ساتھ آرہا ہے۔ رائے عامہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک بڑا حلقہ اس کا مداح ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جے پور کو گلابی نگری کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس گروہ نے اپنا نام رکھا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”یہ گروہ کس کی قیادت میں کام کر رہا ہے؟ اور اتنے کم عرصے میں کیسے اس قدر منظم ہو گیا ہے؟“ راجیو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہل۔ ”اس گروہ کے مقاصد بقا ہر بہت نیک ہیں۔ اس کی تشکیل کا ریڈٹ راجستان جیل سروس کے ایک سینئر افسر دیوی پرشار تریپٹھی کو جاتا ہے جس نے دو سال پہلے اپنی ملازمت سے قبل از وقت رضا کارانہ طور پر ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔“

تریپٹھی کا نام سن کر مراد بری طرح چونکا، مگر اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پایا۔ راجیو کہہ رہا تھا۔ ”جیل کی طویل ملازمت کے دوران مسٹر تریپٹھی کا واسطہ ہر قسم کے جرائم پیشہ افراد سے رہا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی سروس کے آخری ایام کے دوران ہی اس گروہ کو منظم کرنا شروع کر دیا اور جب یہ گروہ باقاعدہ شکل میں منظم ہو گیا تو اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر اس کی قیادت خود سنبھال لی۔“

مراد کے ذہن میں روشنی کے بہت سے جھماکے ہونے لگے کیونکہ اسے اپنے شکار کی بابت کچھ ابتدائی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اسی دوران بانو چائے بنا کر لے آئی اور

ان کے سامنے برتن رکھ کر خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگی۔ مراد قدرے پرجوش انداز میں پوچھنے لگا۔ ”اس گروہ کے مقاصد اور طریقہ واردات کیا ہے؟“

راجیو نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ظاہری طور پر یہ تنظیم سماجی برائیوں کے خاتمے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ دیگر ملکوں کی طرح بھارت میں بھی قانونی نظم کی وجہ سے بہت سارے مجرم قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں، لہذا یہ گروہ یعنی پوتر پالی ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے عزم کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اب جب کوئی قاتل کسی ماتحت عدالت اور سپریم کورٹ سے باعزت بری کر دیا جاتا ہے تو چند روز بعد اس کی لاش کسی فٹ پاتھ یا اس کی خواب گاہ میں پائی جاتی ہے جس کے ساتھ پوتر پالیوں کا مخصوص کارڈ بھی موجود ہوتا ہے۔ بدنام زمانہ راشی افسروں کا بھی اکثر یہی حشر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جو لڑکے دالے، غریب لڑکیوں کے والدین سے جینز کا مطالبہ کرتے ہیں یہ تنظیم ان لڑکوں اور ان کے والدین کو مختلف حربوں سے اس قدر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ارادوں سے باز آجاتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں کی حوصلہ شکنی کے لئے بھی یہ لوگ انتہائی اقدام اٹھا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک یہ پوتر پالی دہشت کے بجائے رحمت کی علامت بن گئے ہیں، البتہ معاشرے کے بااثر طبقات ان کے نام سے بھی نفرت کرتے ہیں۔“

یہ سن کر مراد اور بانو کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بانو قدرے پرجوش انداز میں بولی۔ ”یہ مقاصد تو بہت اچھے ہیں، اگر کوئی فرد یا گروہ واقعی یہ کام کر رہا ہے تو وہ سراہے جانے کے قابل ہے۔“

راجیو چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے معذرت کر کے ہاتھ روم کی جانب بڑھ گیا تو مراد نے کہل۔ ”بانو بی بی! تم جس گروہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی ہو جانتی ہو اس کا سربراہ کون ہے؟“ بانو نے نفی میں سر ہلادیا۔ مراد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستگی سے کہل۔ ”اس کا قائد تمہارے بھائی اور دوسرے

بہت سے پاکستانیوں کا قاتل جیل سپرنٹنڈنٹ تریبا بھی ہے جسے کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہش لئے ہم لوگ بھارت آئے ہیں۔" یہ سن کر چند لمحوں کے لئے بانو گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد راجیو داپس آکر بات چیت میں شامل ہو گیا۔ وہ مراد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو اپنا تعارف بھی کرادیں۔" مراد خوش دلی سے گویا ہوا۔ "میرا نام ارجن شرما ہے اور یہ شانتی ٹھاکر ہیں۔ ہمارا تعلق دہلی کے ایک غیر سرکاری ادارے "In Search of Peace" سے ہے جو اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں یونیسف اور یونیسکو کے تعاون سے مختلف سروے کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم دونوں راجستھان آئے ہیں۔"

وہ تینوں بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ بانو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس گروہ کے لوگ آپ کے مخالف کیوں ہو گئے ہیں۔ بظاہر تو آپ ظالم نظر آتے ہیں نہ ذریعہ اندوز!" راجیو یک دم بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ "مس شانتی ٹھاکر! یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر زیادہ الجھی ہوئی نہیں۔ جب میں نے راجستھان یونیورسٹی سے جرنلزم کی ڈگری حاصل کی تو وہیں آشنائی لڑکی بھی میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے جس کے باعث ہمارے تعلقات خاصے خوشگوار ہو گئے جو عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی قائم رہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے "راجستھان پیڑیکا" جو ان کر لیا جبکہ آشنائے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر مختلف جرائد اور اخبارات کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔"

"چھ ماہ قبل اس کے تاجر باپ کو اس گروہ نے اس کی دکان ہی میں چھت دابے نچکے سے لٹکا کر پھانسی دے دی اور لاش کے قریب پڑے ہوئے رقعے میں اس پر ناجائز منافع خوری اور زندگی بچانے والی جعلی ادویات کی فروخت کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ آشا اپنے ماں باپ کی انوکھوتی اولاد ہے۔ اس کی ماں تو بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے

اسے ماں کا بھی پیار دیا تھا۔ اس کا باپ بڑا ہی شریف انسان تھا اور جان بوجھ کر کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا۔ آشا کا کہنا یہ ہے کہ اس سانحے کی تہہ میں ایک دوسری قسم کی سازش کار فرما ہے۔ وہ ہریجن خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے بھارتی معاشرے میں اس کے باپ نے اپنی محنت کی بدولت نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ مارکیٹ میں موجود بڑے بڑے جغادری ناموں والے تاجر اس سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے "پوتر پالی" گروہ کے اشتراک سے اس بے گناہ کو قتل کر دیا۔ قتل سے پہلے اس کے بوڑھے باپ رام دیال کو گناہ کالوں کے ذریعے دھمکی دی گئی تھی کہ وہ چند روز میں اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے دفع ہو جائے ورنہ اس کی جوان بیٹی کو اٹھالیا جائے گا اور خود اس کا براہِ حشر ہو گا۔

"بوڑھے رام دیال نے ان دھمکیوں پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور آخر کار وہ مارا گیا۔ اس خوفناک سانحے کے بعد آشنائے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنالیا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کا کھوج لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچائے۔ اس ضمن میں اس نے مجھ سے بھی تعاون کے لئے کہا ہے۔ ہم دونوں پہلے ہی سے انوسٹی گیٹور پورنگ پر یقین رکھتے تھے چنانچہ ہم نے اس گروہ کے خلاف کام شروع کر دیا جس کے دوران کئی کشمکشات ہوئے۔ ہم جے پور میں ان کے ہیڈ کوارٹر میں چلے گئے۔ آشنائے تو اس میں باقاعدہ شمولیت بھی اختیار کر لی تھی مگر کچھ ابتدائی کامیابیوں کے بعد ہم گروہ کی نظروں میں آ گئے اور دھرنے لگے۔ میں تو جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا مگر وہ بے چاری جانے کس حال میں ہوگی۔" دکھ بھرے واقعات سن کر وہ دونوں مزید دکھی ہو گئے۔ رات بہت چلی تھی لہذا تینوں سونے کے لئے چلے گئے۔

اگلی صبح ٹاشٹے کی میز پر راجیو نے جانے کا ارادہ کیا تو مراد نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "راجیو! تمہارا گھر یقیناً ان لوگوں کی نظر میں ہو گا تمہارا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" راجیو مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارجن جی! آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ آپ نے

کل جو میری مدد کی تھی اس کے لئے جیون بھر احسان مند رہوں گا اور ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اپنی بساط کے مطابق آپ کے کام آنے کی بھی کوشش کروں۔ ویسے آپ میرے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں اتنا بھی تر نوالہ نہیں۔ پہلی بار تو میں اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کے سبب ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا، ورنہ میرے اپنے ذرائع بھی کچھ کم نہیں۔“

بانو اس کی بات سن کر زیر لب مسکرا دی اور آہستہ سے بولی۔ ”راجیو جی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ دوبارہ بھی اپنی اسی خود اعتمادی کے سبب ان لوگوں کے ہاتھ لگ جائیں گے۔“ راجیو سپاٹ لمبے میں کہنے لگا۔ ”نہیں شانتی جی! ایسا نہیں ہوگا۔ ویسے آپ لوگوں کی تسلی کے لئے بتا دوں کہ میں واپس اپنے گھر نہیں جا رہا، بلکہ گاندھی نگر میں ایک محفوظ ٹھکانے پر جا رہا ہوں۔ جس کی بابت مجھے اور آشا کے سوا کسی کو علم نہیں اور مجھے دشواری ہے کہ وہ جان تو دے سکتی ہے مگر اس بارے میں انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔ ویسے مجھے صرف اس کی چتا لگی ہے۔ اس کے لئے میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ بھلے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

راجیو کے جانے کے بعد وہ خاصی دیر اسی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران کال بیل بجنے لگی۔ مراد نے دروازہ کھولا تو راجیو کو سامنے کھڑے دیکھ کر اسے حیرانگی ہوئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ ملنے چلا آئے گا۔ اس پر مستزاد اس کے ساتھ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکی بھی تھی جو اندر داخل ہو گئی تھی۔ وہ خاصی خوش شکل تھی مگر کسی قدر سہمی سی لگ رہی تھی جس کی وجہ سے خوبصورتی کچھ مائل ہی پڑ گئی تھی۔

راجیو نے مسکراتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”رات میں نے اپنی ساتھی آشا کا ذکر کیا تھا جو پاپیوں کے قبضے میں رہ گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں اپنے گاندھی نگر والے مکان میں پہنچا تو یہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی

بڑی خوشی وہاں میری منتظر ہوگی۔“

بانو نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو واقعی خوشی کا مقام ہے، مگر یہ وہاں سے رہا کیسے ہوئی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے مجھے یہ سب کچھ۔“ راجیو کے جواب دینے سے پہلے آشانے دھیمے سردوں میں کہنا شروع کیا۔ ”انہوں نے ہم دونوں کو تنگ نگر میں ایک مکان میں قید کر رکھا تھا جسے وہ اپنے ذیلی اڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہماری نگرانی کے لئے وہاں کل چھ افراد تھے۔ جب اچانک راجیو بھاگ نکلا تو پانچ آدمی اس کی تلاش میں روانہ ہو گئے اور مجھ پر نظر رکھنے کے لئے صرف گیان چند باقی رہ گیا۔ اسے جب مکمل تنہائی میسر آئی تو اس کی نیت خراب ہونے لگی۔ صورت حال کی مناسبت سے میں نے بھی اس کی کسی قدر حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔

”اس دوران میں نے اسے چائے پلانے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ گدھا فوراً کچن میں گھس کر چائے تیار کرنے لگا۔ میں نے فوراً کچن کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور بھگوان کا نام لے کر بھاگ کھڑی ہوئی اور سیدھی گاندھی نگر پہنچی اور شب وہیں بسر کی۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں راجیو بھی پہنچ گیا اور اب آپ لوگوں کے سامنے موجود ہوں۔“

بانو نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آشا! آپ یہ بتائیں ان کے درمیان پہنچ کر آپ نے کچھ ٹھوس معلومات حاصل کیں یا اڑنے سے پہلے ہی دھری گئیں۔“

آشا کچھ دیر بانو کی آنکھوں میں جھانکتی رہی جیسے وہ کسی تذبذب کا شکار ہو، پھر دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ”میں ساری بات آپ کو ذرا تفصیل سے بتاتی ہوں۔ آپ خود ہی اندازہ کر لیں گے کہ کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں۔ راجیو آپ کو یہ تو بتا ہی چکا ہے کہ کس طرح اس گروہ نے میرے پتا کا حلقہ خون کیا۔

”پتا کے قتل کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ قاتلوں کا کھوج لگا کر رہوں گی۔ میں اس گروہ کے مقامی ہیڈ کوارٹر میں ایک مظلوم لڑکی بن کر پہنچی اور میں نے اپنے بارے

میں ایک فرضی کمائی سنائی۔ اپنے چا اور اپنے ہارے میں اصلیت کا بالکل اظہار نہیں کیا۔ خاصی پس و پیش کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گروہ میں شامل کرنے کی ہائی بھری۔ اس سلسلے میں مجھے کئی روز تک باقاعدگی سے وہاں جانا پڑا۔

”شروع میں کچھ ہفتے چند ہندو نما اشخاص بھاشن دیتے رہے جو مختلف ہندو نصائح پر مشتمل تھے۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے سبق مختلف کیسٹوں اور استادوں کے ذریعے دیئے جاتے رہے۔ قابل ذکر بات یہ کہ اس دوران وہاں کسی ایک شخص نے بھی مجھے بری نگاہ سے نہیں دیکھا اور میں اس گروہ سے ذہنی طور پر متاثر ہونے لگی تھی۔

پنچک روز مجھے بتایا گیا کہ میری تربیت کا صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کی تکمیل کے بعد مجھے باقاعدہ طور پر گروہ کے معزز ارکان میں شامل کر لیا جائے گا اور شانتی جی! آپ جانتی ہیں وہ مرحلہ کیا تھا؟“

آشا کا لہجہ کچھ گڑبڑا سا لگتا تھا۔ مراد اور بانو تجس بھرے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی استفسار سے لگتا تھا بدستور اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد آشا نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”اس مرحلے پر مجھے آدرش دیا گیا کہ میں ”پوتر اشنان“ (مقدس غسل) کر لوں تاکہ اس سے پہلے کے جیون میں کئے گئے میرے تمام گناہ دھل جائیں اور میں تمام دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جاؤں۔“

”یہ پوتر اشنان بظاہر عام غسل ہی تھا مگر یہ ہیڈ کوارٹر کے ایک خاص ہاتھ روم میں ہوتا ہے۔ اسے ہاتھ روم کہنا تو مناسب نہیں کیونکہ وہ تو پورا شیش محل تھا جس کے دروازے دیوار اور چھت جدید قسم کے آئینوں سے آراستہ تھے۔ پانی گروہ کی ایک ادھیز عمر سا دھو خاتون نے پہلے اشنان کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کیا۔ میں نے پوتر اشنان کر لیا۔ تب تک مجھے کوئی قابل اعتراض پہلو نظر نہیں آیا“ مگر اگلے ہی روز مجھے اس گروہ کے شیطانی ہتھکنڈوں سے آگاہی حاصل ہو گئی۔ جب گروہ کے خواتین ونگ کی نائب سربراہ نے اپنے کمرے میں مجھے وہ فلم دکھائی جو پوتر اشنان کے دوران وہاں پوشیدہ حساس کیمروں کے

ذریعے تیار کی گئی تھی۔ اس بذھی حرافہ نے مجھے دھمکی آمیز لہجے میں نصیحت کی کہ اس پوتر اشنان کے بعد واپسی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی فرد گروہ کے کسی حکم سے سرکائی کی جرأت کرتا ہے، تو انتہائی ماہر فوٹو گرافر اس فلم میں تراشیم اور اضافے کر دیتے ہیں جس کے بعد یہ فلم مذکورہ فرد کے حلقہ احباب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ دھمکی سننے کے بعد میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ میں اس شیطانی گروہ کی سرگرمیاں منظر عام پر لاؤں گی۔ گروہ کے حکام کو جانے کیسے مجھ پر ٹک ہو گیا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے کے بعد پتہ چلا کہ راجیو بھی ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔“

آشا اپنی طویل رام کمائی شانے کے بعد خاموش ہو گئی۔ مراد کی زبان پر ایک سوال آگیا۔ ”آشا جی! اس تمام عرصے میں آپ کی ملاقات گروہ کے قائد تریپاٹھی سے ہوئی؟“ آشا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا محض ذکر ہی سنا ہے۔ ویسے بھی وہ چند سینئر ترین پاپیوں کے سوا کسی سے نہیں ملتا۔“ بانو راجیو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”آپ اپنے اخبار میں یہ سب کچھ کیوں نہیں چھاپ دیتے۔“ راجیو اس کی سادہ لوحی پر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”شانتی جی! یہ مسئلہ اتنا سادہ ہوتا تو میں کب کا عمل کر چکا ہوتا۔ اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر سے میں نے بات بھی کی تھی مگر یہ سن کر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ”تمہیں پتہ ہے یہ گروہ بڑے سے بڑے آدمی کے خلاف انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے نہیں ہچکچاتا۔ اس کے علاوہ عوام میں وہ انتہائی مقبول ہیں اور عام آدمی کے نزدیک پوتر پانی دیوتا سامان ہیں۔“

مراد پوری بحث سے بے نیاز جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد راجیو اس کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”ارجن بھیا! آپ کہاں گم ہیں؟“ مراد چونکتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری باتیں سن رہا ہوں اور اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ ان کے مقامی آشرم میں داخل ہونے کے کیا امکانات ہیں؟“

راجیو نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہونا سب

نہیں۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو تہا پھی یا کسی دوسرے سینئر شخص تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ آشا اور میں تو مین گیٹ پر ہی شناخت کر لئے جائیں گے لہذا.....“

وہ بات کو ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بانو ٹھہرے ہوئے لمبے میں کہنے لگی۔ ”راجیو باو! آپ چنتا نہ کریں۔ میں ان کے اڈے میں داخل ہو کر تہا پھی تک رسائی حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔“

آشا دھیرے سے کہنے لگی۔ ”شناختی دیدی! میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ وہ لوگ اچھے نہیں۔“

مگر بانو نے مراد کی جانب دیکھتی ہوئے مستحکم لمبے میں کہا۔ ”آپ لوگ ایسے ہی گھبرا رہے ہیں۔ ارے بھئی اب میں ایسی کالچ کی کڑیا بھی نہیں کہ یہ کام نہ کر سکوں۔ دیسے بھی اگر کوئی مشکل محسوس ہوئی تو آپ لوگوں کو اطلاع کر دوں گی، ورنہ وہاں سے واپس چلی آؤں گی۔ بہر حال یہ بعد کی باتیں ہیں، پہلے مجھے باہر ہی سے وہ آشرم تو دکھا دو۔“

مراد اور راجیو بڑی دیر تک اسے سمجھاتے رہے مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئی اور یہی فیصلہ ہوا کہ اگلے روز اسے پوتہ پانی گروہ کا مقامی ہیڈ کوارٹر دکھایا جائے گا جس کے بعد آئندہ کی حکمت عملی طے کی جائے گی۔

اگلے روز ناشتے کے بعد بانو سیوارام کے سائیکل رکشہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی پہاڑی قلعے ”امبر فورٹ“ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہ پہاڑی قلعہ بے پور سے گیارہ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے بانو دوسرے کئی رکشہ ڈرائیوروں کو قدرے حیرانی سے دیکھ رہی تھی جن کے پیچھے تین تین سواریاں لدی تھیں اور وہ انہیں کھینچ کر پہاڑی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ وہ بے ساختہ سیوارام کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”سیوارام! تم اور یہ دوسرے لوگ مھن اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کس قدر تکلیف دہ کام کر رہے ہو۔ تم کوئی دوسرا دھندا کیوں نہیں کر لیتے جس میں تمہاری عزت نفس بھی مجروح نہ ہو۔ اس ترقی یافتہ دور میں ایک انسان دوسرے انسانوں کے لئے

باربرداری کے جانور کی طرح کام کرے، یہ تو سراسر انسانیت کی تذلیل ہے۔ کیا تمہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوا؟“

سیوارام نے سائیکل چلاتے ہوئے ایک لمبے کے لئے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”شری متی جی! آپ کا مشورہ ٹھیک ہے، مگر مجھے اس دھندے کے علاوہ کوئی ایسا کام بتائیں جس میں محنت کش کی تذلیل نہ کی جاتی ہو۔ گاڑیاں صحیح کرنے والے کمینک جب گاڑیوں کے نیچے لیئے انہیں ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں تو کیا انسانیت کی تذلیل نہیں ہوتی؟ شاندار کاروں کے اندر بیٹھے مالکان جب جاتے ہوئے ان مزدوروں کی طرف اجرت کے پیسے یوں اچھالتے ہیں جیسے بھیک دے رہے ہوں تو کیا وہ انسانیت کے احترام کے تقاضوں کے عین مطابق ہے؟ کماری جی! یہ سب وہ الفاظ ہیں جو کتابوں ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ ان باتوں کو رہنے ہی دیں تو زیادہ اچھا ہے۔“ سیوارام کے لمبے میں تلخی کا عنصر غالب تھا۔

بانو بھی چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی۔ اعصاب کو بو جھل کر دینے والی یہ خاموشی کچھ دیر چھائی رہی صبحی سیوارام اپنا سر جھٹکتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔ ”ہاں تو شری متی جی! وہ سامنے جو قلعہ نظر آ رہا ہے، یہ چھ سو سال تک ریاست کی راجدھانی رہا ہے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر اس کی راہداریاں جس خوبصورتی سے بنائی گئی ہیں، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ شیش محل دیکھیں گی جس کے در و دیوار آئینوں نے آراستہ ہیں جہاں موسمِ بقی کا چھوٹا سا شعلہ ان طلسمی آئینوں کی بدولت لمبے بھر میں ہزاروں متحرک روشنیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ صدیوں پہلے بھی ایسے ماہر کاری گر موجود تھے جنہوں نے پہاڑی نیلوں کو جادو نگری میں تبدیل کر دیا تھا۔“

امبر فورٹ دیکھنا تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل مقصد تو اس سے تھوڑی دوری پر واقع دیران سا قلعہ تھا جو کبھی کسی راجہ کا مسکن رہا تھا۔ اس کے سامنے سے گزرتے

ہوئے تو شکست کھنڈرات ہی نظر آئے تھے جہاں چنگاڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، مگر آشا اور راجیو کے بقول یہی پرانی سی عمارت پوتر پالپوں کا مقامی ہیڈ کوارٹر تھا۔ سامنے سے گزرتے وقت بانو نے اسے بغور دیکھا، مگر دروازے پر مسلح گارڈز کے سوا اسے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔

وہاں سے واپسی کے سفر میں سیوارام اسے جے پور کے تمام بڑے ہوٹلوں کے باہر گھماتا رہا، کیونکہ اس نے اپنے ذہن میں جو حکمت عملی طے کی تھی، اس کے مطابق اسے ان ہی میں سے کسی ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ سیوارام جے پور کے سبھی اچھے ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ماہر گائیڈ کے مانند اپنی معلومات کا ذخیرہ اس کی جانب منتقل کر رہا تھا۔ ”یہ سامنے والا ہوٹل رام بلچ پبلز ہے اور وہ سوائی مان سنگھ ہوٹل ہے۔ اس سے کچھ دوری پر جے محل پبلز ہوٹل ہے۔“

اس طرح وہ اسے لے کر جے پور اشوکا اور کلارک آمیر کے سامنے سے گزرا۔ بانو کو سیر و تفریح سے کوئی خاص دلچسپی تو نہیں تھی، مگر ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ زمانہ بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ ان ہوٹلوں میں سے اکثر وہ محل تھے جنہیں راجوں مہاراجوں نے اپنی رہائش کے لئے بنوایا تھا۔ اس وقت ان کے اوپر سے پرندے بھی سے ہوئے گزرتے تھے کیونکہ حرم سراؤں میں نازک اندام راہگاریاں موجود ہوتی تھیں، مگر آج ان محل سراؤں میں محض چند سو روپے ادا کر کے کوئی بھی ایرا غیرا قیام کر سکتا تھا۔

بانو اس قسم کے خیالوں میں کھوئی تھی کہ سیوارام کی آواز سے اپنی دنیا سے باہر لے آئی۔ ”شری متی جی! ہم واپس گھر آگئے ہیں۔“ رکشے سے اتر کر وہ آئندہ کی حکمت عملی پر غور کرنے لگی اور سہ پہر کی چائے پر مراد سے مشورے کے بعد ہوٹل جے محل کی طرف چل پڑی۔ مراد نے بہت کہا کہ وہ پروگرام اگلے روز کے لئے ملتوی کر دے مگر وہ اپنا ہدف جلد از جلد حاصل کر لیتا چاہتی تھی۔

ہوٹل جے محل منزل اور راجستھانی طرز تعمیر کے امتزاج کا عمدہ شاہکار تھا۔ استقبال پر خوبصورت سی ادھیڑ عمر خاتون نے اسے خوش آمدید کہا۔ ایک رجسٹر میں اس کا نام پتہ درج کرنے کے بعد اس نے روم سروس ہوائے کو بلا کر چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”میڈم کو روم نمبر ساٹھ میں پہنچا دو۔“

بانو اپنا پرس گھماتی ہوئی پراعتقاد قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا اپنی کس روم سروس ہوائے نے پہلے ہی اوپر پہنچا دیا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے طائرانہ نظروں سے چاروں جانب دیکھا۔ انتہائی نفاست سے ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔

روم سروس ہوائے ابھی تک مودب کھڑا تھا۔ ”میڈم کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں۔“ بانو نے نفی میں سر ہلادیا تو وہ نمسکار کر کے باہر نکل گیا۔

رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ اس نے کمرے ہی میں کیک کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ پیدل ہی ہوٹل سے باہر نکل گئی۔ حسب پروگرام سیوارام پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ وہ امبر فورٹ کی جانب روانہ ہو گئی۔ اتوار ہونے کی وجہ سے امبر فورٹ روڈ پر بہت ٹریفک تھی۔ تقریباً ساڑھے دس بجے وہ امبر فورٹ پہنچ گئے۔

سیوارام نے پوچھا۔ ”شری متی جی! کیا آج فورٹ کے اندر چلیں گی یا باہر ہی رکنا ہے۔“ بانو نے کہا۔ ”یہاں سے چائے پی کر آگے بڑھتے ہیں۔“ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ساتھ والے دیران قلعے میں زندگی کے کچھ آثار ہیں بھی یا نہیں۔ قلعہ نسبتاً نئی جگہ پر تھا اس لئے وہاں سے صاف نظر آرہا تھا۔ آدھ گھنٹے میں کوئی شخص اس عمارت سے باہر نکلتا دکھائی دیا اور نہ کوئی اندر داخل ہوا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے سیوارام سے بولی۔ ”چلو بھی سیوارام! مجھے وہ سامنے والے قلعے کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد وہیں گیٹ پر میرا انتظار کرنا مجھے کچھ دیر ہو جائے تو واپس مت جانا۔“

سیوا رام سائیکل چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شانتی جی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں بھلا واپس کیوں جانے لگا۔ اپنا تو کام ہی سیوا کرنا ہے۔ میں شام تک یہاں سے ایک انچ بھی اُدھر اُدھر نہیں ہوں گا۔ آپ چٹانہ کریں۔ اگر آپ شام تک واپس نہ آئیں تو جا کر ارجن شرمابی کو آپ کے بارے میں اطلاع بھی کر دوں گا۔“

بانو رکشہ سے اتر کر گیٹ کی جانب بڑھی۔ دروازے پر مسلح گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ وہ پُر اعتماد قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب جا پہنچی۔ گیٹ بدستور بند تھا۔ گرے رنگ کی یونیفارم میں لمبوس دونوں گارڈز اس کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔

ادھیڑ عمر گارڈ آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے ہوئے بولا۔ ”نسے میڈم! میں یہ پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہوں کہ آپ کو کسے ملنا ہے؟“ اس کا لہجہ بھی الفاظ کے مانند شائستہ تھا۔ بانو بے نیازی سے کندھے اچکائی ہوئی بولی۔ ”کسی بھی ذمے دار آدمی سے ملاؤ۔“ گارڈ نے اس کی بات دھیان سے سنتے ہوئے کہا۔ ”آپ ذرا انتظار کیجئے میں ابھی اندر بات کر رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ گیٹ سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کیمین میں داخل ہو گیا اور انٹرکام پر کسی سے بات کرنے لگا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ باہر تک آرہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”گپتا جی! ایک ماری گیٹ پر کھڑی اندر آنے پر بضد ہے۔“ جواب میں دوسری جانب سے پتہ نہیں کیا کھا گیا کہ گارڈ نے دوبارہ کہا۔ ”مہاراج! اس کا اصرار ہے کہ وہ کسی ذمے دار شخص سے ملنا چاہتی ہے۔ جی ہاں! شکل و صورت کی بری نہیں بلکہ خاصی اچھی ہے اور خاصی پڑھی لکھی بھی لگتی ہے ٹھیک ہے میں اسے اندر بھجوا دیتا ہوں۔“

ریسیور رکھنے کے بعد وہ گارڈ اس کی جانب بڑھا۔ ”آئیں شری متی جی! مسٹر گپتا آپ کے منتظر ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گیٹ کا بظنی دروازہ کھول دیا۔ بانو کچھ کے بغیر اس کے پیچھے چل پڑی۔ گیٹ سے تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک تنگ سے کاریڈور میں داخل ہوئے جس کے دونوں جانب کمروں کی قطاریں تھیں۔ بانو کو محسوس ہوا عبارت

باہر سے جتنی خستہ حال نظر آتی ہے اندر سے اتنی بری نہیں۔

تقریباً پچاس فٹ آگے جا کر گارڈ داہنی جانب مڑا اور پہلے دروازے کے باہر ہلکی سی دنگلی دی۔ پھر مڑ کر بانو کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے ایک پنڈت نما شخص نے موٹے شیشوں کی عینک سے بنور دونوں کی جانب دیکھا۔ پھر وہ گارڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے رجنی کانت! تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔“ رجنی کانت متوذب انداز میں سر کو ہلکے سے خم دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

میز کے سامنے پڑی خالی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ شخص بولا۔ ”بہنیں کماری جی! مجھے گپتا کہتے ہیں۔ جن کمار گپتا۔“ بانو تھوڑا سا ہنسیکھاتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں میں دونوں جانب خاموشی رہی۔ گپتا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ بانو خود کو کچھ زورس سا محسوس کر رہی تھی، مگر جلد ہی اس نے خود کو تسکین لیا۔

گپتا کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا، مگر پھر خود ہی بات شروع کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جی دیوٹی جی! بتائیں آپ نے یہاں آنے کا کسٹ کیسے کیا اور میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔“

بانو اب گھبراہٹ پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی، پھر بھی اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ”شریمان گپتا جی! میرا نام شانتی ہے، شانتی ٹھاکر۔ اور میرا تعلق دہلی سے ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

گپتا مہاراج اس کے سراپا پر نظریں جماتے ہوئے گویا ہوئے۔ ”آپ گھبراہٹ میں نہیں، جو بات بھی کرنی ہے کھل کر کہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔“ بانو میز پر ایک کہنی نکالتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ ”اصل میں ایک سیمیا (مسک)

من اردو ڈاٹ کام

یہ کہہ کر بانو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں اٹھ سے ہوئے آنسو ساڑھی کے آٹچل سے صاف کیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”پورے سنسار میں شیا پر شاد اور ماسوں چند لعل کے سوا میرا کوئی غمگسار نہ رہا۔ ویسے اس گھڑی میرے شوہر شیا پر شاد نے مجھے بھرپور سسارا دیا ورنہ شاید میں آتما ہتیا ہی کر لیتی۔ میں اس کے خلوص کی دل سے قائل ہو گئی اور اسے دل کی گمراہیوں سے چاہنے لگی۔

”کچھ دنوں بعد اس نے تجویز پیش کی کہ میری صحت کے لیے آب و ہوا اور جگہ کی تبدیلی ضروری ہو گئی ہے اور مجھے تمام جائداد بیچ کر اس کے ساتھ کینڈا چلے جانا چاہئے۔ کیونکہ اس کی طویل غیر حاضری کے سبب وہاں اس کا بزنس متاثر ہو رہا ہے۔ ماسوں چند لعل نے بھی اس کی تائید کی۔ میرا ذہن اس وقت قوت فیصلہ سے ویسے ہی عاری ہو چکا تھا لہذا تھوڑی سی پس و پیش کے بعد میں نے ہاں بھر لی۔

”ان دنوں نے ایک ماہ کے اندر میرا مکان اور پٹائی کی دکان فروخت کر دی اور تمام دوسرے اثاثے بھی مجھ سے ہتھیا لیے۔ یہ ساری جائداد چالیس لاکھ سے زیادہ کی فروخت ہوئی۔ میرا پاسپورٹ پہلے ہی سے تیار کر دیا گیا تھا۔ وقتی طور پر ہم دونوں نے سبھاش نگر دہلی میں چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے لی تاکہ جب تک دیرے کا انتظام نہیں ہو جاتا وہاں رہ سکیں۔

”چند روز بعد شیا پر شاد میرے تمام کاغذات لے کر سفارت خانے ویزا لگوانے گیا، مگر ایسا گیا کہ پلٹ کر واپس نہ آیا۔ میں نے جب اس کی تلاش کی تو عقدہ کھلا کہ وہ اسی روز دوپہر کی فلائٹ سے امریکہ جا چکا ہے۔ مزید کھوج پر یہ بھی پتہ چلا کہ وہاں پہلے سے ہی اس کے بیوی بچے ہیں۔ میں ماسوں چند لعل کے گھر جا کر روٹی چلائی، مگر اس نے بھی نکا سا جواب دے دیا کہ تم نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے، میں اس معاملے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔

”ایک دو ہفتوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا پولیس میں جعل سازی کی ایف آئی

لے کر حاصل ہوئی ہوں۔ میرے ساتھ ایک شخص نے بت ظلم کیا ہے۔ میں نے سنا ہے آپ کی جماعت ہر قسم کی معاشرتی نا انصافیوں اور سماجی برائیوں کے خلاف یدھ (جنگ) کر رہی ہے۔ مجھے بھی آپ لوگوں کی سمائتا (مدد) درکار ہے۔“

گپتا مہاراج بھی اب کچھ کھلنے لگے تھے۔ آواز میں ہلکی سی اپنائیت پیدا کرتے ہوئے بولے۔ ”وہ تو میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کسی گھور سبیا (سنگین مسئلے) سے دوچار ہیں، ورنہ آپ جیسی سندریا بیاں یوں انجانی جگہوں پر دھکے نہیں کھاتیں، مگر آپ بتائیں تو سہی کہ آپ جیسی دیوی پر کس را کہش نے ظلم کیا ہے۔ ہم اسے پاگل سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

بانو اب خاصی پُر اعتماد نظر آرہی تھی۔ متوازن لہجے میں بولی۔ ”میرا تعلق پرانی دہلی کے علاقے فیروزی سے ہے۔ میرے پتا وہاں کپڑے کا ہول سیل دھندا کرتے تھے۔ ہمارا گھرانہ بہتی کے متمول گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ دو برس پہلے پٹائی کا ہارٹ انیک سے دیسانت ہو گیا۔ میری ماں خالص گھریلو عورت تھی جس نے ساری عمر اپنی دلیز سے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ اس کے علاوہ میرا ایک بھائی تھا جس کی عمر تقریباً نو سال تھی۔

”پٹا جی کے مرنے کے بعد سارا کاروبار میری ماں کے بھائی چند لعل نے سنبھال لیا اور ہم لوگوں کو پٹا کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ چند ماہ بعد اس نے میری ماں کو قائل کر لیا کہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے جاننے والے شیا پر شاد سے کر دی جائے۔ شیا پر شاد پچھلے دس بارہ برس سے کینڈا میں مقیم ہے اور مبینہ طور پر مالی لحاظ سے بہت مستحکم ہے۔ میری ماں کو اسی کا انتظار تھا شادی کے دو ہفتے بعد وہ ابدی خند سو گئی۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی، مگر شاید ابھی مزید صدمے میری قسمت میں لکھے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی روشن لعل صبح سکول جانے سے پہلے حسب معمول اپنی یونیفارم پر استری پھیر رہا تھا کہ استری کی نگلی تار سے چٹ کر رہ گیا۔ وہ موقع ہی پر ہلاک ہو گیا یہ سانحے اتنی تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے تھے کہ میں وقتی پر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔“

آر درج کراؤں، مگر کسی مثبت نتیجے کی امید کم ہے۔ پولیس نے مقدمہ تو درج کر لیا مگر ان مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا۔ آس پڑوس اور دور پار کے رشتے داروں کا بھی رویہ مختلف نہیں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا بڑا قدم اٹھاتے وقت میں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا، اب ان کے سامنے دکھڑے رونے سے کیا حاصل۔ اس مرحلے پر اکثر ملنے والوں نے شبہ ظاہر کیا کہ میری ماں اور بھائی کی اموات میں بھی یقیناً شیا پر شادی ملوث ہے۔ اب میں خود بھی پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو یہی لگتا ہے کہ میرے معصوم بھائی کی موت حادثاتی نہیں بلکہ یقیناً اسے قتل کیا گیا تھا۔

یہ کہتے ہوئے بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ گیتا جی اس طویل گفتگو کے دوران خاموش رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”سب شانتی تھا کہ یقیناً آپ بہت دکھی ہیں۔ آپ کا غم اتنا بڑا ہے کہ حوصلے اور صبر کی تلقین جیسے الفاظ بے وقعت سے لگتے ہیں، مگر اسی کو جیون کہتے ہیں۔ زندگی ایسے ہی حادثات کا دوسرا نام ہے۔ جو ہوتا تھا ہو چکا، اب یہ بتائیں کہ آپ کیا چاہتی ہیں۔“

بانو نے اپنی بھگی پلکیں صاف کرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ”مہاراج! دنیا میں میرے لیے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ پچھلے کچھ عرصے سے اخباروں اور دیگر ذرائع سے آپ کی تنظیم کا چرچا سنتی رہی ہوں۔ اب یہی آس لے کر آئی ہوں کہ جیسے آپ بھی مظلوموں کی سہاہت کرتے ہیں، اسی طرح اس راکشس سے انتقام لینے میں میری مدد کریں گے۔ اس کے علاوہ میں خود بھی آپ کے گروہ میں شامل ہو کر ظلم و ناانصافی کے خلاف مظلوموں کی مدد کرنا چاہتی ہوں تاکہ شیلار شاد جیسے دیگر ظالم میرے معصوم بھائی جیسے بچوں اور مجھ جیسی بے سارا عورتوں پر مزید ظلم نہ کر سکیں۔“

یہ سن کر گیتا کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بانو کو اندیشہ ہوا کہ یہ خبیث شخص کہیں انکار ہی نہ کر دے، چنانچہ زمانے بھر کی مظلومیت اپنی آواز میں سمیٹتے ہوئے وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”پلیز گیتا جی! انکار مست کیجئے گا، ورنہ میں یہاں سے واپس زندہ نہیں جاؤں گی اور میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔“

گیتا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو سب ٹھیک ہے شری مٹی جی! مگر میں اکیلا آپ سے کوئی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہماری تنظیم معاشرتی جرائم کے خلاف لڑ رہی ہے، مگر اس کے کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ کوئی فرد واحد اس بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا، ہر کام ہر سطح پر مشاورت اور مربوط طریقے سے ہوتا ہے۔ ویسے آپ ناامید نہ ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہو، اور یہ یقین بھی دلاتا ہوں کہ اگر ہمارے گروہ نے آپ کی مدد کا فیصلہ کر لیا تو آپ کے بھروسوں کو زمین کی تہ سے بھی نکال لیا جائے گا۔ اب تو آپ واپس چلی جائیں، البتہ اپنی رہائش اور رابطے کا فون نمبر دیتی جائیں تاکہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جاسکے۔“

بانو نے کہا۔ ”شریمان! فی الحال تو میں ہوٹل جے محل کے کمرہ نمبر ساٹھ میں ٹھہری ہوں، مگر آپ فیصلہ کرنے میں دیر تو نہیں لگائیں گے نا۔“

گیتا اس کے بچکانہ اصرار پر ہلکے سے مسکرایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ چٹانہ کریں۔ امید ہے آپ کے حق ہی میں فیصلہ ہوگا۔ اچھا بھگوان نے چاہا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔“ بانو کھڑی ہو گئی اور اسے پر نام کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھی۔

گیتا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرس شانتی جی! میں ابھی آپ کو اپنے آدی کے ساتھ باہر تک بھجواتا ہوں۔ اصل میں یہاں کے کچھ قواعد ہیں۔ کوئی نووارد اکیلا یہاں گھوم پھر نہیں سکتا امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گی۔“

بانو نے نڈیا نہ لہجے میں کہا۔ ”بھلا میں کوئی بات مانڈ کیوں کرنے لگی۔ آخر ہر ادارے یا تنظیم کے کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں ورنہ کام کیسے چلے۔“ اتنے میں گیتا کا ماتحت اندر داخل ہو چکا تھا جو بانو کو لئے باہر کی جانب چل پڑا۔ بانو جب مین گیٹ سے باہر نکلی تو سیوارام کو اپنا ٹھہرایا۔ بانو کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آگئی تھی، مگر یہ لحاظ

کیفیت تھی۔ فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور آنکھوں سے بیزاری جھانکنے لگی۔

بانو رکشے میں سوار ہوئی تو وہ کوئی بات کہنے بغیر چل پڑا۔ اس کا یہ رویہ روٹھا روٹھا سا انداز بانو کو اچھا نہیں لگا۔ تھوڑی دور آنے کے بعد اس نے کہا۔ ”سیوارام! کیا بات ہے؟ تم کچھ ناراض سے لگتے ہو۔ کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے؟“

سیوارام نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ارے شری متی جی! بھلا آپ جیسے بڑے لوگوں سے بھی کبھی غلطی ہوتی ہے۔ غلطی پر تو ہم جیسے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کا یوں اتنی دیر اندر رہنا اچھا نہیں لگا۔ میں تو آپ کو بڑی بھلی مانس باری سمجھ رہا تھا۔“

بانو کو اس کے احمقانہ رویہ پر کس پر کاؤ تو بہت آیا مگر ان کی تہ میں جو مخلصانہ جذبات تھے انہیں محسوس کر کے اس کے دل میں سیوارام کی عزت اور بڑھ گئی۔ جب وہ امبر فورٹ سے گزر کر آمیر روڈ کی جانب مڑے تو کچھ دور چلنے کے بعد سیوارام بڑبڑایا۔ ”مجھے لگتا ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔“

بانو پوچھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟“ سیوارام نے کچھ تیز آواز میں کہا۔ ”ارے شری متی جی! ہمارا دل کہتا ہے کہ ہمارا پیچھا ہو رہا ہے اور ہمیں پتہ ہے کہ ہمارا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ بانو آہستگی سے بولی۔ ”ایک بات کا دھیان رکھنا کہ تمہاری کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ ہمیں اپنے تعاقب کا علم ہے۔“ سیوارام خاموشی سے رکشہ چلاتا رہا۔ بانو کے لئے یہ انکشاف اتنا غیر متوقع نہیں تھا اس لئے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد سیوارام نے کہا۔ ”وہ پینے رنگ کا سائیکل رکشہ اور آگے جانے والی سرخ موٹر سائیکل مسلسل ہمارے تعاقب میں ہیں۔“

بانو نے دھیرے سے کہا۔ ”تم ان پر لعنت بھیجو اور میری بات دھیان سے سنو کیونکہ ہونٹ آنے والا ہے۔ تم مجھے یہاں اتار کر ارجن شرما کے پاس جانا اور اسے بتانا کہ اپنے

تعاقب کی وجہ سے میں آج وہاں نہیں آسکتی اور وہ لوگ ابھی قومی طور پر مجھ سے رابطے کی کوشش نہ کریں۔ ویسے انہیں تبلی رینا کہ چتا کی لکڑی بات نہیں۔“ سیوارام اسے ہونٹ لے کر باہر اٹک کر آگے بڑھ گیا۔

بانو نے کمرے میں پہنچنے کے بعد بانو سوچتے لگی کہ بڑا بڑا اندازہ بالکل صحیح نکلا ہے، مگر اب یہ شکل پیدا ہو گئی تھی کہ ان سے رابطہ کیسے کرے۔ وہ اس ڈر سے فون بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مبارک اس کا فون سنبھال کر آیا ہو تاہم وہ خوش تھی کہ معاملات اس کی حسبِ خواہش آگے بڑھ رہے ہیں۔

رات کا کھانا اس نے تینے ہال میں کھایا اور اکیلی بیٹھی اپنے موجودہ حالات کی بابت سوچتی رہی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ہال سے اٹھی اور بو جھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور چند لمحوں کے لئے بے خیالی میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سر پرے کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے بعد وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے الماری کی جانب گئی۔ الماری کھلنے پر وہ چند لمحوں کے لئے حیران سی کھڑی رہ گئی۔ صاف نظر آ رہا تھا کسی نے اچھی طرح تلاشی لی ہے۔ خصوصاً اس کے اٹیچی کیس اور کپڑوں کا پوری طرح پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا۔ کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر صحیح طرح موجود نہیں تھی۔

وہ کچھ دیر کھڑی یہ سب دیکھتی رہی اور پھر کپڑے اور اٹیچی اٹھا کر پلنگ پر رکھا اور اٹیں دوبارہ ترتیب سے اٹیچی کے اندر رکھنے لگی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔ انہی خیالوں میں گم تھی کہ اسے ایک جانب سے ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے چوکتے ہوئے اس جانب دیکھا تو خوف کے مارے اس کی چیخ طلق میں انک کر رہ گئی۔ ہاتھ قدم کا دروازہ کھول کر دوڑے گئے بد معاش اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستولوں کا رخ اس کی جانب تھا۔ اس کے پورے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے ان دونوں مسلح افراد کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی

تھی۔

دونوں افراد نے تلے قدموں سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بانو کے قریب پہنچ کر وہ اڑک گئے۔ ان کی نگاہوں کا مرکز وہی تھی اور وہ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی انیس تک جا رہی تھی۔ تمام عمارت سے ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کر پڑا تھا۔ ایسی وجہ سے اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

اکبر سے بدن والا طویل القامت شخص چند لمحے بانو کو گھورتا رہا پھر اپنے ہسٹول کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے غریبا۔ ”سچ بتاؤ تم کون ہو اور کہاں کی رہنے والی ہو؟“ بانو کے لیے اگرچہ یہ سب کچھ غیر متوقع نہیں تھا مگر اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ ”میں شانتی ٹھاکر ہوں، مگر تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ یوں چوروں کی مانند کمرے کی تلاشی کا کیا مقصد ہے؟“

اس بار طویل قامت ہی گویا ہوا تھا۔ ”اس کا جواب بھی تمہیں جلد مل جائے گا، مگر فی الحال میری بات غور سے سنو۔ اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو ہمیں ڈھیر کر دی جاؤ گی۔ بہتری اسی میں ہے کہ جیسے ہم کہیں اس پر عمل کرو۔“ بانو کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔ ”مگر تم ہو کون اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

وہ سرد آواز میں بولا۔ ”ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔ ورنہ تمہیں بے ہوش کر کے لے جانا پڑے گا اور یہ صورت حال تمہارے لیے زیادہ بہتر نہ ہو گی۔“ بانو کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اور وہ شور مچا کر اپنی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی، لہذا اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔“

نوادار کی آواز میں بھی اب قدرے ٹھہراؤ تھا۔ ”ہمارے ہسٹول بظاہر ہماری جیبوں میں ہوں گے لیکن باہر نکل کر اگر تم نے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کی تو نتائج کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔“

بانو کچھ کے بغیر ان کے ساتھ چل پڑی۔ دروازے سے باہر نکل کر طویل قامت کے ساتھی نے کمرہ باہر سے منتقل کر کے چابی اپنی جیب میں ڈالی اور بانو کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

دونوں اسے اپنے حصار میں لیے میڑھیوں سے نیچے اترے اور ہال سے ہوتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت ہال میں خاصے لوگ موجود تھے مگر کسی نے بھی بانو کی اڑی ہوئی رنگت پر دھیان نہ دیا۔

ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی سفید رنگ کی ”ماروٹی“ کار کے نزدیک پہنچے تو ڈرائیونگ سیٹ پر براہمان شخص نے جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ طویل قامت نے بانو کو بچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کا ساتھی دوسری جانب سے بانو کے بائیں طرف آکر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ رات آدمی سے زائد بیت چکی تھی، اس لیے سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ بانو، بے پور سے زیادہ واقف نہ تھی، اس لیے وہ اندازہ نہ لگا سکی کہ اسے کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے کے سفر میں کئی چھوٹی بڑی سڑکوں پر مڑنے کے بعد ایک کوٹھی نما مکان میں داخل ہوئی۔

گاڑی صحن میں رکی تو طویل قامت نے بانو کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک ریلوٹ کی طرح ان کے احکام پر عمل کر رہی تھی۔ دونوں اسے اپنے ساتھ لیے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ خوبصورت فرنیچر اور قالین سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کمین خاصے خوشحال ہیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد طویل قامت نے اسے سامنے پڑے صوفے پر دھکیلتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”اب بتاؤ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟“

بانو کی آواز میں خوف کے ساتھ حیرت بھی شامل تھی۔ ”میں نے کون سا جرم کیا ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ بھی، یا یوں ہی دھمکیاں دیتے جاؤ گے۔“ وہ شخص یک دم کھٹکنے لگے کی

طرح غرایا اور پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”آنند ذرا مہارانی جی کو بتاؤ کہ انہوں نے کیا پردہ کیا ہے۔“

آنند اوسط قد کا گورا چٹا شخص تھا۔ وہ بانو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شری متی شانتی ٹھاکر! میں ذرا تفصیل سے تمہیں جرم سے آگاہ کرتا ہوں لیکن اس سے پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ ہم تمہارے پتی شیاما پرشاد کے آدمی ہیں جس کے خلاف مدد لینے کے لیے تم اپنی گروہ کے پاس گئی تھی۔ کیا تم نے شیاما پرشاد کو اتنا بے وقوف سمجھ لیا تھا کہ وہ تمہاری طرف سے بالکل غافل ہو جاتا۔“

یہ الفاظ سن کر بانو کو عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ خوف کی جگہ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے تھے کیونکہ اسے علم تھا کہ شیاما پرشاد نامی کسی شخص کا ہرگز کوئی وجود نہیں۔ وہ کہانی تو اس نے محض اس لیے گھڑی تھی کہ پوتر پالی گروہ میں شہولیت کی راہ ہموار ہو سکے مگر اب اپنے سامنے سینہ خاوند کے غندے دیکھ کر وہ خود کو پاگل محسوس کر رہی تھی۔ اسے یہ گورکھ دھند بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کیفیت میں شاید وہ سچ اگل دیتی مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پالی گروہ کے لوگ اس کی بیان کر وہ کہانی کی تصدیق کے لیے یہ سارا ڈراما چارہے ہیں۔ یہ سوچ کر اس کا ڈر خاصا کم ہو گیا اور وہ مستحکم لمبے میں بولی۔ ”ہوں! تو تم اس حرامی شیاما پرشاد کے پالتو ہو جسے انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔ کہاں ہے وہ؟ مجھے اس کے پاس لے چلو تاکہ میں اس کہینے سے پوچھ سکوں کہ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا۔ اس نے چند گلوں کی خاطر میرا ہنستا ہنستا خاندان تباہ کر دیا میں اس کتے سے بدلہ لینے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہوں۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہو گئی تھی۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”اے جادوینا کہ اگر اس گروہ کے لوگ میری مدد کے لیے آمادہ نہ بھی ہوئے تو میں تنہا ہی اسے ڈھونڈ کر اپنی بے قصور ماں اور معصوم بھائی کی ہتیا کا انتقام لوں گی۔ وہ دنیا کے کسی

بھی کوئے میں جا چھپے، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی کیونکہ اسے عبرتناک موت مارنا ہی اب میرے جیون کا مقصد رہ گیا ہے۔ میں تم لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھے اس کا پتہ بتا دو۔“

یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور آگے بڑھ کر آنند کا گریبان پکڑ کر ہدایتی انداز میں چیخ رہی تھی۔ ”کہاں ہے وہ ذلیل شخص؟ جاناؤ درندہ میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ آنند اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولا۔ ”پیچھے ہٹو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے! تم پاگل تو نہیں ہو گئی؟“ بانو پر واقعی اس وقت جنون طاری تھا۔ آنند کا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچتے ہوئے وہ شیاما پرشاد کو بدعنائیں دے رہی تھی۔ آنند نے بڑی مشکل سے اسے خود سے علیحدہ کیا اور صوفے پر دھکیل دیا۔

اس دوران طویل قامت خاموش کھڑا مگر نظروں سے بانو کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نے آنند کی طرف مڑ کر کہا۔ ”فی الحال اسے ہمیں بند کر دو۔ ہم چل کر شیاما پرشاد جی کو اس کی بابت اطلاع دیتے ہیں۔“ اس کے بعد وہ دونوں باہر کی طرف بڑھے اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ بانو دروازہ پیٹتے ہوئے بلند آواز سے چلا رہی تھی۔ ”بلاؤ اس حرامی شیاما پرشاد کو۔ آج میں سارا حساب چکا دوں گی۔“

آنند اور طویل قامت اس کی چیخ و پکار نظر انداز کرتے ہوئے ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے میز پر دھرے ٹیلی فون کے ذریعے کسی سے رابطہ کیا اور طویل قامت مودب لمبے میں بات کرنے لگا۔ ”ہیلو گیتا جی! میں بزرگ بول رہا ہوں۔ ہم شانتی کو لے آئے ہیں مگر ہمارے مشاہدے کے مطابق وہ واقعی شیاما پرشاد نامی اپنے پتی کے ہاتھوں ستائی ہوئی عورت ہے۔..... جی میں نے باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ فراڈ بالکل نہیں لگتی۔ اس سلسلے میں آپ کے خدشات بالکل بے بنیاد ہیں۔ جی ہاں! میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے ہم ابھی اسے واپس ہوٹل چھوڑ آتے ہیں۔“

☆=====☆

سیوا رام' بانو کو ہوٹل چھوڑنے کے بعد باہر نکلا اور کچھ دیر عام رکشہ ڈرائیوروں کی طرح ادھر ادھر سوار یوں کی تلاش میں بھٹکتا رہا تاکہ اگر وہ بھی زیر نگرانی ہو تو نگرانی کرنے والوں کو یقین آجائے کہ وہ محض ایک رکشہ ڈرائیور ہی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے تو وہ چاند پول گیٹ کے باہر مراد کے مکان پر پہنچا۔

وہاں مراد کے علاوہ راجیو اور آشا بھی موجود تھے۔ اسے دیکھ کر ان تینوں کے چہرے کھل اٹھے۔ مسکرا کر ان کے بعد سیوا رام بھی ان کی بات چیت میں شامل ہو گیا۔ اس کے بیٹھے ہی آشانے بے صبر لہجے میں کہہ "سیوا رام جی! آپ کہاں رہ گئے تھے؟ ہم تو کب سے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔ کو شانتی دیدی کس حال میں ہیں؟"

سیوا رام کرسی کی پشت پر ٹیک لگاتے ہوئے قدرے سکرایا۔ "آشاجی! کچھ دیر جے کام لیں۔ آپ نے تو آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پہلے مجھ سے چائے پانی کا تو پوچھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے گیش مارکہ بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی سلگنے لگا۔ آشا اس کے اس انداز بے نیازی پر کچھ جھنجھلا سی گئی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

راجیو نے دیر سے کہا۔ "سیوا رام جی! آشا صبح کہہ رہی ہے۔ ہم خاصی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔" سیوا رام ان کی اس کیفیت سے کچھ دیر لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس وقت لاشعوری طور پر اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا آخر اس نے اپنی خاموشی ختم کرتے ہوئے کہہ "آشاجی! ہمارا آج کا مشن ظاہری طور پر خاصا کامیاب رہا ہے۔ میں نے داپسی پر شانتی جی کو بحفاظت ہوٹل پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے آپ لوگوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ ان سے رابطہ کرنے میں پہل نہ کی جائے۔ وہ مناسب وقت پر خود رابطہ کر لیں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پورے دن کی کارگزاری کی تفصیل انہیں سنا ڈالی۔

اس کی بات ختم ہونے کے بعد فوری طور پر کسی نے کچھ نہ کہا۔ سبھی اپنی جگہ

خاموشی سے بیٹھے مختلف خیالات میں گم تھے۔ کچھ دیر بعد مراد اہستگی سے بولا۔ "ہمیں اپنے طور پر شانتی جی کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرنا ہو گا ورنہ وہ کسی مصیبت میں پڑ سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک لپے مگر ہماری مداخلت سے معاملات بگڑ بھی سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے فی الحال شانتی جی کو کسی فوری خطرے کا سامنا نہیں۔ ہمیں ان کی طرف سے رابطے کا انتظار کرنا چاہیے۔" راجیو نے رائے دی۔

مراد نے کچھ کے بغیر اثبات میں سر ہلادیا۔ آشا اٹھ کر کچن کا رخ کرتے ہوئے کہتی گئی۔ "آپ لوگ باتیں کریں میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

کھانے کے دوران میں بھی گفتگو کا محور یہی موضوع رہا۔ کھانے کے بعد راجیو چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارجن جی! آپ نے ساری بات سن تولی ہے۔ آپ کے خیال میں ہمیں کون سا قدم اٹھانا چاہیے؟" مراد کے بجائے سیوا رام نے جواب دیا۔ "میرے دھار میں تو ہمیں فی الحال خاموشی سے تمام صورت حال کا جائزہ لینا چاہئے۔ حالات ہمارے لیے خود ہی کوئی نہ کوئی راہ متعین کر دیں گے۔"

مراد طویل سانس لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تم کسی حد تک صحیح کہہ رہے ہو۔ اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ ہم خاموش رہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم فقط تماشائی بن کر رہ جائیں اور ساری ذمہ داری شانتی پر ڈال دیں۔ ہمیں اپنے طور پر متبادل راستوں کی تلاش جاری رکھنا ہوگی۔"

راجیو کے ذہن میں غالباً کوئی نیا خیال آیا۔ جیسی تو وہ ہلکی سی چٹکی بجاتے ہوئے گویا ہوا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پوتر پانی اتنے کمزور ہرگز نہیں کہ محض شانتی دیدی یا کوئی دوسرا فرد واحد ان کا کچھ بگاڑ سکے۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ ہم کسی طرح ان میں باہمی تفاق ڈال دیں جس سے ان میں دھڑے بندی پیدا ہو جائے۔ ان کے آپسی کراؤ سے ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔"

مراد نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: ”مگر کیسے، راجیو؟ یہ کام کتنے میں جتنا آسان ہے کرنے میں اسی قدم مشکل ہے۔“

راجیو کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگا: ”ارجن جی! پہلے مجھے بات تو مکمل کرنے دیں۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ یہ بڑا آسان کام ہے مگر ناممکن بہر حال کوئی بات نہیں ہوتی۔“ یہ کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا جس کی وجہ سے لگتا تھا اسے اپنے منصوبے کی معقولیت کے بارے میں خود بھی اعتماد نہیں۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ تبھی اپنے طور پر اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔ مراد راجیو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگا: ”راجیو! اب چند کام تمہیں کرنا پڑیں گے۔ کچھ روز پہلے تم نے کہا تھا کہ جے پور کی حد تک تم خاصے بار سوخ ہو اور اس گردہ کے مقابلے میں اتنے ترنوالے بھی نہیں ہو۔“

راجیو نے اس کی بات کا برا مانے ہوئے کہا: ”ارجن جی! آپ کے لہجے میں اگرچہ کسی قدر طنز کا عنصر موجود ہے مگر میں اپنی بات پر ہنوز قائم ہوں اور وقت مہلت کرے گا کہ میں نے محض بڑ نہیں ہانکی تھی۔“

مراد اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم آواز میں گویا ہوا: ”میرے دوست! شاید تم نے میری بات محسوس کی ہے۔ میرا مقصد تمہاری دل شکنی ہرگز نہیں تھا۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ جے پور یا اس کے گرد و نواح میں کوئی ایسا بااثر شخص موجود ہے جو اس گردہ کے مقابلے میں کھلے عام ہماری سرپرستی کر سکے۔“

آشا اور راجیو نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا اور تقریباً ایک وقت دونوں کے منہ سے نکلا: ”ہاں کرل بھوانی سنگھ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

مراد نے منٹولے والی نظریں ان پر ڈالیں۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

راجیو کسی قدر حیرانی سے کہنے لگا: ”ارجن جی! آپ بھوانی سنگھ کو نہیں جانتے؟“

وہی تو اس وقت جے پور کے سارا جہ ہیں۔ اگرچہ ریاستیں ختم ہوئے مدت گزر گئی لیکن سابق حکمران خاندان کی قدر و منزلت آج بھی لوگوں کے دلوں میں ہے۔ گزشتہ بیس سال سے کرل بھوانی سنگھ کی والدہ راج ماتا گائتری دیوی جے پور سے پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوتی آئی ہیں، البتہ ۱۹۷۷ء کی جنتا لہر کے دوران وہ بھی اپنی سیٹ ہار گئیں اور جنتا پارٹی کے گردھاری لعل ریاس نوک سبھا کی سیٹ جیت گئے۔ اس بار سے ”راج ماتا“ اتنی دلبرداشتہ ہوئیں کہ انہوں نے سیاست سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔“

یہ کہتے ہوئے راجیو سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ مراد پورے انتہاک سے اس کی جانب متوجہ تھا کیونکہ اسے روشنی کی ہلکی سی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد راجیو نے اپنی بات مزید آگے بڑھائی۔ ”گائتری دیوی کی ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے سپر کرل بھوانی سنگھ نے سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ وہ کانگریس آئی کے پلیٹ فارم سے سیاست کر رہے ہیں۔ ابھی تک جنتا پارٹی کے گردھاری لعل ہی نوک سبھا کے ممبر ہیں مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے ماہ جنتا پارٹی کی آپسی پھوٹ کے نتیجے میں مراد جی ڈیپائی حکومت ختم ہو گئی ہے اور اندرا کانگریس کی حمایت سے چودھری چرن سنگھ وزیر اعظم بن گئے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اندرا گاندھی کسی بھی وقت اپنی حمایت واپس لے سکتی ہیں جس کے نتیجے میں مدثرم انتخابات ناگزیر ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے تمام سیاسی جماعتیں اور شخصیات آئندہ الیکشن کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔“

راجیو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تو مراد نے کہا: ”تم نے خاصی لمبی تمہید باندھی ہے، مگر شاید ہم اصل موضوع سے ہٹ چکے ہیں۔ ہمارا مقصد بھارتی سیاست پر گفتگو نہیں۔“

راجیو دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہنے لگا: ”نہیں مسٹر ارجن! میں اصل موضوع ہی پر آرہا ہوں۔ جے پور میں سبھی کو معلوم ہے کہ موجودہ رکن پارلیمنٹ گردھاری لعل کو پوتر پانی گردہ کی مکمل آشیرداد حاصل ہے اور یہ بات بھوانی سنگھ کے

لیے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے کیونکہ بے پور میں یہ کردہ خاصا مقبول ہے مگر ابھی تک بھوانی سنگھ اس کا توڑ دریافت نہیں کر پایا۔ اگر ہم کسی طرح کرنل کو یہ یقین دلا سکیں کہ ہم پوتر پانیوں کے خلاف اس کے مضبوط حلیف ثابت ہو سکتے ہیں تو وہ لازماً ہماری سرپرستی کرے گا اور اسی طرح ہم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

سیوا رام اور آشنا ساری بات چیت کے دوران قطعاً خاموش رہے تھے۔ مراد چند لمحوں کے چروں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر خود کلاسی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”سسر راجیو! یہ بات ابھی قبل از وقت ہے کہ ہم بھوانی سنگھ کو استعمال کریں گے یا وہ ہمیں اپنے مفاد کے لیے بطور چارہ استعمال کرتا ہے، لیکن ہمیں بہر حال اس سے رابطہ کرنا ہو گا۔“ رات گئے تک وہ صلاح مشورے میں مصروف رہے اور آئندہ کی حکمت عملی طے کر کے اٹھے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ سیوا رام تو اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا، البتہ راجیو اور آشنا نے رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆=====☆=====☆

بانو کو بحفاظت واپس ہوئے پتہ چلایا گیا تھا۔ اس کے اعصاب نہایت کشیدہ تھے۔ اگرچہ حالات اس کی توقع کے مطابق وقوع پذیر ہو رہے تھے اور نتائج بھی زیادہ حوصلہ شکن نہیں تھے، اس کے باوجود گزشتہ رات کے واقعے نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی قدر کمزور و کٹ پرکھڑی ہے جہاں کسی وقت بھی کوئی بڑا سانحہ رونما ہو سکتا ہے۔ دوسری جانب اسے یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ وہ مراد سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ایسے حالات میں اسی سے کچھ رہنمائی حاصل ہو جاتی۔

اگلے دو روز اس نے ہوئے ہی میں گزارے تھے۔ وہ یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ اسے خود پوتر پانیوں سے رابطہ کرنا چاہیے یا ان کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ گپتا سے ملاقات کے دوران اس نے ان کے بارے

میں بات کیوں نہیں کی۔

شام کے چھ بجتے والے تھے لیکن گرمی کی شدت اب بھی برقرار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کچھ دیر کھلی فضا میں وقت گزارنا چاہیے۔ وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ کمرے کے دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی کہ جانے اس وقت کون ٹپک پڑا ہے۔ بستر سے اٹھ کر وہ محتاط قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی۔ اس دوران دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا اور ایک جانب سبک کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے کا پٹ کھول کر اندر داخل ہونے والی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ نسکار کرنے کے بعد نووارد عورت پر اعتماد قدموں سے چلتی ہوئی صوفے کی جانب بڑھی۔ اس نے سادہ پرنٹ کی ساڑھی پس رکھی تھی۔ قدرے فربہ جسم کی مالک یہ عورت خاصی باوقار لگ رہی تھی۔

صوفے پر بیٹھنے کے بعد وہ بانو سے مخاطب ہوئی۔ ”شانتی جی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ آپ اتنی گھبراہٹی ہوئی کیوں ہیں؟“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خود میزبان ہو اور بانو اس سے ملنے آئی ہو۔ بانو کچھ کے بغیر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”جی فرمائیے! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں؟“ وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام شوبھا پنڈت ہے اور جہاں تک سیوا کا تعلق ہے وہ تو ہم آپ کی کریں گے۔“

بانو اس کے ذہنی جواب سے کچھ گڑبڑا سی گئی تھی، مگر اس نے خاموش رہنے ہی میں عاقبت سمجھی، چند لمحوں شوبھا پنڈت اس کے سراپے کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ ”مس شانتی ٹھاکر! مجھے گپتا جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب کسی چٹا کی ضرورت نہیں۔ سبھی معاملات ہم لوگ خود ہینڈل کر لیں گے۔ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ سسر گپتا آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

بانو یہ سن کر خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ ”مجھے کہاں چلنا ہو گا آپ کے ساتھ؟“ شوبھا

من اردو ڈاٹ نیٹ

مراد اس محل نما عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ بھلے ہی ریاستیں وغیرہ ختم ہو گئیں ہیں، مگر سابق حکمرانوں کے ٹھانڈے ہاتھ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا رہن سہن ابھی تک ان کے شاندار ماضی کا آئینہ دار تھا۔ اس سلسلے میں ان کی معاونت وہ خزانے کر رہے تھے جنہیں ان کے آباد اجداد نے عوام کا خون نچوڑ کر بھرا تھا اور لگتا تھا آنے والی کئی نسلوں کے لیے بھی یہ دولت خاصی ہوگی۔

انہی خیالات میں غم وہ ایک شاندار ہال میں داخل ہوئے۔ یہ ڈرائنگ روم کسی مغل دربار کے دیوان خاص کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد مہاراج کرمل بھوانی سنگھ کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ راجستھان کے رواجی لباس میں لباس تھے۔ طویل قامتی اور سرخ و سپید رنگت نے اس شخص کی جسمانی وجاہت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ راجپوت کو دیکھ کر مراد نے بھی اظہار تعظیم کے لیے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ کرمل کے ساتھ تقریباً تیس سال کا عام چہرے مرے کا شخص بھی اندر آیا۔

کرمل کے بیٹھے کے بعد ان تینوں نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ فوراً ہی چند ملازم چائے کا سامان لیے اندر داخل ہوئے۔ مراد کو لگ رہا تھا جیسے وہ قرون وسطیٰ کے دور میں پہنچ چکا ہو۔ چائے پیش کرنے کے بعد ملازمین کرنے سے باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں ان چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کرمل کی عمر اگرچہ پچاس سے تجاوز کر چکی تھی مگر دیکھنے میں وہ پینتیس چالیس کا ہی لگ رہا تھا۔

اس نے خود چائے نہیں پی بلکہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بنا کچھ کے خاصی دیر ان دونوں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔

راجپوت اس سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔ خود مراد بھی اس کی بار بار شخصیت سے متاثر تھا، مگر اس کی کیفیت راجپوت والی بہر حال نہیں تھی۔ کرمل نے انہیں نگاہوں ہی سے خاصی دیر تک جانچنے کے بعد پوچھا۔ ”ہاں تو مسٹر راجپوت! آپ نے کس سلسلے میں مجھ سے ملنے کی زحمت کی؟“

پنڈت کی آواز میں شفقت کا رنگ غالب تھا۔ ”میں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ چلیں جلدی تیار ہو جائیں۔“

بانو نے کچھ سوچ کر خود کو پوری طرح حالات کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہاتھ روم کی جانب بڑھی، منہ دھو کر کپڑے بدلے اور کچھ دیر بعد وہ شوبھا پنڈت کے ہمراہ ہوٹل سے باہر نکل رہی تھی۔ سرخ رنگ کی فیٹ کار میں بیٹھ کر شوبھانے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور بانو کے لیے اگلا دروازہ کھول دیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد شوبھا پنڈت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆=====☆

راجپوت اور مراد خاصی سوچ بچار کے بعد حتمی طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ انہیں فوراً کرمل بھوانی سنگھ سے رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ اس مرحلے پر کسی طاقتور شخصیت کی پشت پناہی کے بغیر وہ اپنے منصوبے کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ راجپوت نے فون پر کرمل بھوانی سنگھ کے نمبر ڈائل کیے تو دوسری جانب سے اس کے سیکرٹری نے فون اٹھایا تھا۔ ”جی آپ کون صاحب ہیں اور کرمل صاحب سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہیے ہیں؟“

”مسٹر! میرا نام راجپوت ہے اور میرا تعلق پوتر پانی سنگھن سے ہے۔ میں چند اہم معلومات کرمل صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“ یہ سنتے ہی سیکرٹری نے کرمل سے اس کی بات کرا دی تھی۔

کرمل کی آواز خاصی دنگ تھی۔ ”ہاں تو مسٹر راجپوت! آپ کا تعلق بھلے ہی کسی سے بھی ہو۔ ایسی باتیں فون پر مناسب نہیں ہوتیں۔ دیے بھی میں اس وقت مصروف ہوں۔ آپ ایک گھنٹے بعد ٹھیک گیارہ بجے میرے پاس آجائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

راجپوت کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا تھا۔

مراد اور راجپوت کچھ دیر بعد کرمل کی رہائش گاہ راج نواس کے لیے روانہ ہو گئے۔

آج سہ پہر دہلی میں کانگریس پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں نکلنوں کی تقسیم کا معاملہ زیر غور آئے گا۔ لہذا آپ سے دہلی پہنچنے کی درخواست کی گئی ہے۔" یہ سن کر کرٹل کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ اپنے سیکرٹری کو باہر جانے کا کہہ کر وہ دوبارہ مراد اور راجیو کی طرف متوجہ ہوا۔ "ابھی ہم جس بارے میں بات کر رہے تھے وہ مرحلہ بہت قریب آگیا ہے۔ اس ایکشن میں ہم لوگ سبھا سیٹ کے لیے چناؤ لڑیں گے جبکہ ہمارے یہ کامریڈ ڈاکٹر چندر بھان صوبائی نشست کے لیے امیدوار ہوں گے۔"

"بچھلے چناؤ میں جتنا پارٹی کے گردھاری لعل، راج ماما کو شکست دے چکے ہیں جو ہمارے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہے۔ ہمارے نزدیک لوگ سبھا سیٹ جیتنا یا ہارنا اتنا اہم نہیں، مگر جے پور ریاست سے جہاں ہزاروں سال سے ہمارے باپ دادا حکمران رہے ہیں۔ ہمارے خاندان کا ہارنا محض ایک نشست کی ہار نہیں بلکہ ہمارا تمام تر خاندانی پس منظر گنا جانے کے مترادف ہے، لہذا اب ہم یہاں سے شکست افروز نہیں کر سکتے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ میرے پاس تو آپ لوگوں کے لیے فی الحال زیادہ وقت نہیں، مگر آپ ڈاکٹر چندر بھان سے مزید مشاورت کے بعد اپنی آئندہ حکمت عملی طے کر لیں لیکن یہ خیال رہے کہ ہمیں جے پور کی سیٹ ہر قیمت پر جیتی ہے۔ آپ کو جو بھی مدد درکار ہو، ڈاکٹر بھان کو بتادیں۔ ویسے ایک بات کی وضاحت کرنا چلوں کہ مجھے پوتر پانی گروہ سے کوئی ذاتی پُر خاش نہیں اور تریا بھی کو بھی میں اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی قسم کی دوستی یا دشمنی رکھی جائے مگر وہ ہماری انتخابی سیاست کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا ہے، لہذا اسے ختم کرنے کے لیے تم لوگوں کو ہر طرح کی مدد فراہم کی جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں کیونکہ مجھے ایک بجے کی فلائٹ سے دہلی پہنچنا ہے۔ آپ ڈاکٹر سے تمام معاملات طے کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی کرٹل بھوانی کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی احتراماً اپنی سیٹوں سے اٹھ گئے اور جب تک وہ کمرے سے نکل نہیں گیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ مراد قدم قدم پر

راجیو اس کے سامنے کچھ زیادہ ہی دب سا گیا تھا، لہذا مراد نے خود بات کرنا مناسب جانے۔ "مدارج! مجھے ارجن شرماتے ہیں۔ ہمارا تعلق عرصے سے پوتر پانی گروہ سے ہے، مگر اب مسٹر تریا بھی کی پالیسیوں سے اختلاف کی بنا پر ہم نے ان سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے ساتھ کارکنوں کی بڑی تعداد ہے۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ یہ گروہ آپ کا بھی سخت مخالف ہے، لہذا ہماری درخواست ہے کہ آپ ہماری سرپرستی کریں تاکہ ہم اور آپ اپنے مشترکہ دشمن کو ختم کر سکیں۔"

کرٹل کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا۔ "وہ سب تو ٹھیک ہے، مگر تم لوگ اب ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو اور اس کے بدلے ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہو؟" مراد کی آواز پر اعتماد، مگر دھیمی تھی۔ "ہمیں آپ سے ہر طرح کی پشت پناہی چاہیے جس میں مالی وسائل سے ملے کر افرادی قوت کی فراہمی بھی شامل ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس گروہ کو ختم کرنے کے علاوہ آپ کی انتخابی مہم میں بھی بھرپور معاونت کریں گے۔"

بھوانی سنگھ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا، "شاید تم لوگ ان سے واقف ہو۔ یہ ڈاکٹر چندر بھان ہیں۔ راجستھان یوتھ کانگریس آئی کے صدر اور ہمارے معاون خصوصی اور

اس کی بات ادھوری تھی کہ بیرونی دروازے پر ہلکی سے دستک کے بعد کرٹل کا سیکرٹری اندر داخل ہوا۔ کرٹل کے قریب آکر سر جھکاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز سے بولا۔ "سوری مدارج! دخل اندازی کے لیے معافی چاہتا ہوں، مگر اطلاع دینا ضروری تھا۔ ابھی دہلی سے خبر موصول ہوئی ہے کہ راشنرٹی نیل سنجو ریڈی نے لوگ سبھا توڑ دی ہے کیونکہ پردھان منتری چودھری چرن سنگھ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے خود ہی پارلیمنٹ توڑنے کی سفارش کی ہے۔ دیش میں مذہم ایکشن کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ایکشن تک چرن سنگھ کو ہی عبوری وزیر اعظم مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں

محسوس کر رہا تھا کہ حکومت جانے کے باوجود حکمرانی کا نشہ هنوز باقی تھا۔

اب کمرے میں وہ تینوں ہی تھے۔ ڈاکٹر چندر بھان نے ملازم کو بلا کر کہہ دیا تھا کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے کیونکہ وہ اہم بات چیت میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد وہ مراد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہاں سسرار جن شرما! آئندہ کی پلاننگ کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم کچھ ابتدائی مگر بنیادی معلومات کا تبادلہ کر لیں۔ پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ اس گروہ میں آپ کے ہم خیال کتنی طاقت رکھتے ہیں اور کن شعبوں میں آپ کو ہماری مدد درکار ہے؟“

مراد اس کا مدعا سمجھ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر چندر بھان! اپنی طاقت یا کمزوری کا اظہار خود اپنے منہ سے اچھا نہیں لگتا۔ اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا کہ ہم میں کس قدر اہلیت ہے۔ البتہ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اس گروہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور.....“

ڈاکٹر چندر بھان اس کی بات اچکتے ہوئے بولا۔ ”قطع کلائی کی معافی چاہتا ہوں مگر یہاں پر میں آپ کی ایک بہت بڑی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارا مقصد اس گروہ کا خاتمہ ہرگز نہیں کیونکہ شاید آپ کو اس گروہ کے قیام کا صحیح پس منظر معلوم نہیں۔ یہ گروہ تو بھارت کے قومی مفادات کا بہت بڑا محافظ ہے۔ ہمارا مقصد اس کی موجودہ قیادت کو ہٹانا ہے کیونکہ موجودہ قیادت کا جھکاؤ بوجہ بھارتی جتنا پارٹی کی مقامی قیادت کی طرف ہے۔ جب کہ ہماری خواہش ہے کہ یہ گروہ کم از کم جے پور کی حد تک اپنا وزن کانگریس کے پلڑے میں ڈال دے اور اپنی موجودہ قومی خدمات کو اسی طریقے سے جاری رکھے۔“

مراد اس کی بات سن کر بری طرح چونکا تھا۔ ”ڈاکٹر! آپ کی گفتگو سے میں کچھ کنفیوز سا ہو گیا ہوں۔ آپ بار بار قومی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں اور پوتر پانی گروہ کو قومی مفادات کا محافظ قرار دے رہے ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟“

ڈاکٹر خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ کئی منٹ وہ اسی حالت میں رہا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”سسرار جن شرما! مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کے ساتھ اس بارے میں بات کرنی چاہئے یا نہیں مگر خیر جب ہم اکٹھے کام کر رہے ہیں تو ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرنا پڑے گا۔“

مراد اس کی تمہید سے کچھ اکتا گیا تھا۔ ”ڈاکٹر! آپ کھل کر بات کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ایسے معاملات میں گھما پھرا کر بات کرنے سے اکثر اوقات غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔“ ڈاکٹر چندر بھان بھی اب کچھ کھل گیا تھا۔ ”شرما جی! مجھے امید ہے آپ اس بات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خود تک محدود رکھیں گے کیونکہ یہ دلش کے مفادات کا معاملہ ہے۔ شاید آپ کو علم نہ ہو کہ اس گروہ کی تشکیل تین سال قبل کانگریس آئی کی مرکزی سرکار کے حکم پر ہی کی گئی تھی۔ حکومتی اکابرین اور خفیہ سرکاری اداروں کی قیادت کا خیال تھا کہ حکومتی ادارے ہمسایہ ممالک خصوصاً پاکستان کے اندرونی معاملات میں ایک حد سے زیادہ ملوث نہیں ہو سکتے کیونکہ بین الاقوامی سطح پر بدنامی کا خوف ہر معاملے میں آڑے آتا ہے جس کی وجہ سے حکومتی ادارے کھل کر بعض کام نہیں کر سکتے۔ لہذا کسی ایسی غیر سرکاری تنظیم کا وجود ضروری قرار دیا گیا جس کا بظاہر حکومت یا سرکاری اداروں سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو تاکہ اس تنظیم کی سرپرستی میں ہم پاکستان جیسے ممالک میں اپنی مرضی کا کردار ادا کر سکیں اور وہاں ہر طرح کی لسانی، گروہی اور فرقہ دارانہ عصبیتوں کو ہوا دے کر دہشت گردی کا بازار گرم کر سکیں۔ اس طرح ”ہینگ لگے نہ پھٹکری“ کے مصداق خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جا رہے ہیں۔

”گزشتہ چند سال سے پاکستانی صوبہ سندھ میں کئی حوالوں سے بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس بے چینی کو بڑھادا دینے کے لیے مجوزہ نئی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر سندھ سے ملحقہ بھارتی صوبے راجستھان میں قائم کیا گیا۔ تب سے یہ گروہ سندھ میں لسانی اور سیاسی بنیادوں پر خاصی منافرت پیدا کر چکا ہے اور اس کا کوئی ٹھوس الزام بھی بھارت سرکار پر

نہیں لگ سکتا۔ اگر پاکستان میں ہمارا کوئی ایجنٹ پکڑا بھی جاتا ہے تو وہ یہی بتاتا ہے کہ اس کا تعلق ایک غیر سرکاری مذہبی اور سماجی تنظیم ”پوتر پالی“ سے ہے۔ اس طرح سفارتی سطح پر نفٹ اٹھائے بغیر ہمیں اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو رہے ہیں۔“

مراد یہ باتیں سنتے ہوئے خود کو ذہنی طور پر مفلوج سا محسوس کر رہا تھا کیونکہ بظاہر سب کچھ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا مگر سامنے موجود حقائق کو وہ جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جرائم پیشہ گروہ بھارت سرکار کے ہاتھوں ادارے کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر چندر بھان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ”۱۹۷۷ء میں انداز گاندھی کے اقتدار سے بٹنے کے باوجود اس گروہ کو ”را“ اور مرکزی حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور یہ پاکستان کو کھوکھلا کرنے کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔ اس کے صدر مسٹر تپا بھی جے پور سے جتنا پارٹی کے لوگ سمجھا ممبر گروہاری لعل کے کالج فیلو رہے ہیں۔ اسی ذاتی وابستگی کی وجہ سے وہ یہاں کی مقامی سیاست میں کانگرس کے مخالف فریق کی مدد کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہم صرف انہیں راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں مگر اس تنظیم کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔“

ڈاکٹر چندر بھان نے مراد کی حیرت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے شرما جی؟ آپ تو کہیں اور ہی کھوئے ہوئے لگ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ مراد خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوا۔ ”ڈاکٹر صاحب“ میں ٹھیک ہوں۔ ذرا اس بارے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کام ایسے کرنا ہو گا کہ سانپ بھی نہ مرے اور اس کے زہریلے دانت بھی توڑ دیے جائیں۔“

راجیو کو بھی اس گروہ کی اصلیت جان کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست شخص تھا اس لیے اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ ان کی حکومت پاکستان دشمنی میں اس حد تک گرفتار ہے کہ انسانیت اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کو بھی فراموش کر بیٹھی ہے۔

☆=====☆

بانو اور شوبھا ہوٹل سے سیدھی پوتر پالی سنگھن کے مقامی ہیڈ کوارٹر پہنچی تھیں۔ جہاں چند روز قبل بانو کی گپتا جی سے ملاقات ہوئی تھی۔ مین گیٹ میں داخل ہونے کے بعد ان کی گاڑی بائیں جانب وسیع و عریض گراؤنڈ کی جانب بڑھی جسے غالباً کار پارکنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں پہلے ہی سے آٹھ دس گاڑیاں کھڑی تھیں۔

بانو کو عمارت کی وسعت پر خاصی حیرانی ہو رہی تھی کیونکہ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ قلعہ نما عمارت اتنے زیادہ رتبے پر پھیلی ہوگی۔ جے پور کی اکثر عمارتوں کی طرح اس کی تعمیر میں بھی اینٹوں کی بجائے پتھر استعمال کیا گیا تھا۔

شوبھا پنڈت انجمن بند کر کے نیچے اتری اور بانو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک جانب بڑھی۔ بانو نے بھی مزید کوئی سوال کیے بغیر اس کی تقلید کی۔ اصل عمارت میں داخل ہونے کے بعد کئی راہداریاں مڑنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا جسے لکڑی کی پارٹیشن کے ذریعے تین مختلف حصوں میں بانٹا گیا تھا۔

شوبھا پنڈت اسے لیے جس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئی اس کی ج جھج سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ شوبھا کمرے کے وسط میں رک کر اس کی جانب مڑی۔ ”مس شانتی ٹھاکرا آج سے تم اس اپارٹمنٹ کی مالک ہو۔ اب تم یہیں رہائش رکھو گی۔“

یہ بات بانو کے لیے قطعی غیر متوقع تھی لہذا جلدی سے کہنے لگی۔ ”مگر میرا سارا سامان تو ہوٹل میں پڑا ہے۔“ شوبھا نے اپنایت سے کہا۔ ”مس ٹھاکرا تم اس کی چھتاہ کرد۔ تمہارا سامان بھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا اور ہوٹل مل وغیرہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔ یہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ ساتھ والے کمرے کو تم ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کر سکتی ہو جس کے ایک حصے کو ڈرائنگ روم کے طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔“

ون اردو ڈاٹ کام

مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کریں گی۔ بہر حال میری طرف سے مبارکباد وصول کریں کہ آپ کی درخواست پر آپ کو گروہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ البتہ باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے میں کچھ دیر لگے گی کیونکہ چند ضابطے کی کارروائیاں ابھی باقی ہیں۔ آپ اب کسی قسم کی فکر نہ کریں کیونکہ اب آپ کے تمام مسائل کے حل کی ذمہ داری ہماری تنظیم کی ہے۔“

بانو نیاز مندانہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”شریمان جی! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے تنظیم میں شمولیت کی میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ یہ سب آپ کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ویسے میں آپ کو دشواہ دلاتی ہوں کہ آپ کو اس فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہو گا۔ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ گروہ کی خدمت کروں گی۔“

گپتا شفقت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آج تو آپ اپنے اپارٹمنٹ میں جا کر آرام کریں۔ کل سے آپ کی باقاعدہ کلاسز شروع ہو جائیں گی جن کے ذریعے آپ کے ذہن کی تمام کشائیں چند روز میں دور ہو جائیں گی۔“ پھر وہ شوبھا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”شوبھا جی! انہیں واپس لے جائیں اور ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھیں اور ہاں مس ٹھاکرا! آپ اگر کوئی دقت محسوس کریں تو فوراً شوبھا جی کے ذریعے مجھے بتائیں۔“

بانو نے جھپکتے ہوئے کہا۔ ”شریمان جی! اگر میں ہوٹل ہی میں رہوں اور روزانہ یہاں آجایا کروں تو اس میں کیا فحاشت ہے؟“ گپتا کی آواز میں ہلکی سی تلخی آگئی تھی۔ ”نہیں مس ٹھاکرا ایسا ہونا ناممکن ہے۔ چند روز پہلے آشنائی لڑکی نے ہمارے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے۔ اس واقعہ کے بعد اصول و ضوابط پر بڑی سختی سے عمل شروع کر دیا گیا ہے، بہر حال اس وقت مجھے کہیں جانا ہے لہذا.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

بانو سمجھ گئی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے، لہذا خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ واپس پہنچی تو اس کا سارا سامان ہوٹل سے لایا جا چکا تھا۔ اپنے کپڑے اپنی سے نکال کر الماری میں رکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ جیتے جی جانے اے قفس سے اسے

اس سے ملحقہ اپارٹمنٹ میرا ہے۔ اس طرح تمہیں بوریت نہیں ہوگی۔“

بانو کوئی جواب دیے بغیر ہوں ہاں پر اکتفا کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں البتہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی انجانے جال میں بری طرح پھنس کر رہ گئی ہے اور یہاں سے اب اسے کوئی معجزہ ہی نکال سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ خواہ مخواہ بہادری جنانے کے چکر میں یوں پھنس گئی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں مراد وغیرہ کے ساتھ رابطہ کرنا بھی تقریباً ممکن ہو گیا ہے۔ شوبھا پنڈت کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہی پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ ”فی الحال تم میرے ساتھ آؤ کیونکہ مسز گپتا نے تمہیں یاد کیا ہے۔“ چند لمحوں بعد وہ بانو سے مخاطب ہوئی۔ ”میں تمہیں آپ کی بجائے تم سے مخاطب کر رہی ہوں کیسے تم نے اس بے تکلفی کا برا تو نہیں منایا۔ اصل میں تم عمر میں مجھ سے خاصی چھوٹی ہو۔ ویسے بھی جانے کیوں تم سے کچھ اپنائیت سی محسوس ہو رہی ہے لہذا.....“

بانو نے اسے یقین دلایا کہ اس نے شوبھا کی بے تکلفی کا برا نہیں منایا تو شوبھا خوشدلی سے کہنے لگی۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم مائنڈ نہیں کرو گی۔ بہر حال آؤ گپتا جی سے مل لیں۔“ کچھ دیر بعد وہ دونوں گپتا جی کے کمرے میں موجود تھیں۔ بانو نے رسی طریقے سے اسے پرنام کیا اور خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

گپتا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مس ٹھاکرا! خیریت تو ہے، آپ کچھ گھبرائی سی محسوس ہو رہی ہیں۔“ بانو نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے خود کو سنبھالا دینے کی کوشش کی کیونکہ وہ اوکھلی میں سر دینے کے بعد مصائب سے گھبراٹا لا حاصل تھا۔ ”نہیں گپتا جی! گھبراہٹ کی تو خیر کوئی بات نہیں، البتہ نئے ماحول میں ایک اجنبیت کا احساس تو ہوا ہی ہے۔ وقت کے ساتھ یہ چیز بھی دور ہو جائے گی۔ ویسے بھی خامسے کمزور اعصاب کی مالک ہوں۔“

گپتا تسلی دینے والے انداز میں گویا ہوا۔ ”ہاں رتی طور پر ایسا محسوس ہو گا ہی، مگر

چھٹکارا بھی مل پائے گا یا نہیں۔

☆=====☆=====☆

مراد اور راجو اس وقت گاندھی نگر والے مکان میں بیٹھے بانو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ اچانک ہوٹل چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی اور یہ بات ان کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی اگرچہ انہیں علم تھا کہ وہ گردہ کے ہی کسی ٹھکانے پر ہوگی مگر اس کے باوجود اس بات کا امکان تھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہو اور وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہو۔ اس سوچ نے مراد کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اسی دوران وہاں آشابھی آگئی۔ وہ آتے ہی جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نے بھی اپنے طور پر شانتی دیدی کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے مگر اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ مجھے آپ دونوں پر بھی حیرت ہے کہ ابھی تک آپ زبانی جمع خرچ میں مصروف ہیں اور عملی طور پر کچھ بھی نہیں کر پائے۔“

وہ دونوں اس کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کیونکہ بظاہر وہ جو کچھ کہہ رہی تھی سو فیصد درست تھا۔ راجو کچھ خفیف سا ہو کر کہنے لگا۔ ”ہم بھی تو فارغ نہیں بیٹھے۔ ہم نے کڑی بھوانی سنگھ سے بھی بات کر لی ہے۔ تم دیکھنا ہم جلدی اپنا کام شروع کر دیں گے۔“

آشاکے لہجے میں جھنجھلاہٹ بدستور موجود تھی۔ ”بھاڑ میں جائے بھوانی سنگھ بھی اور تم بھی۔ اس سے بات کرنے کا نتیجہ آخر کیا نکلا۔ یہی نہ کہ شانتی دیدی غائب کر دی گئی۔ اس روز تم بڑیں ہانک رہے تھے کہ ہم بہت جلد اخباری مہم چلا کر پوتر پانی گردہ کو بے نقاب کر دیں گے مگر اس جانب تم نے ذرا سی بھی پیش رفت نہیں کی۔“

مراد نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”آشابی! آپ کہہ تو صحیح رہی ہیں مگر ہم ذرا سازگار حالات کا انتظار کر رہے ہیں۔ اصل میں چند روز پہلے لوک سمبھائی ہے لہذا تمام اخبارات اسی حوالے سے خبروں کو اہمیت دے رہے ہیں۔ اخبار کا عام قاری بھی وہی

خبریں دلچسپی سے پڑھ رہا ہے۔ دیے بھی یہ اتنا بڑا واقعہ ہے جس نے وقت طور پر اخبارات کے تمام صفحات کو گھیر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کی گرد ذرا سی بیٹھ جائے تو اپنا کام شروع کر دیں۔“

آشا آج طنز کے سارے تیر چلا دینا چاہتی تھی۔ ”مسٹر! جن شاید آپ کو برا لگے مگر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ اور راجو نرے گفتار کے غازی ہیں۔ آپ لوگ سماروں کی تلاش میں ادھر ادھر جھک مار رہے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ کسی قسم کا رسک لیے بغیر ہی سارے معاملات خود بخود حل ہو جائیں 'ورنہ ایسا کون سا کام ہے جو کوشش اور ہمت سے نہیں ہو سکتا۔“

مراد کو اس کی کھری باتوں پر ناؤ تو بہت آ رہا تھا مگر باتیں سچ تھیں لہذا خاموش رہا۔ راجو البتہ اپنی اس قدر توہین برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لہذا تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ ”آشا پلیز! ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“

آشا درمیان ہی سے اس کی بات کٹتے ہوئے کہنے لگی۔ ”نہیں مسٹر راجو! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ نہ تو بزدلی کی کوئی حد ہوتی ہے اور نہ دلیری کی۔ آپ خود پر ہی نگاہ ڈالیں تو آپ کو لگے گا کہ بزدلی کی تمام حدیں پھلانگنے کے باوجود آپ کسی مزید سارے کی تلاش میں سرگرداں ہیں تاکہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔“

یہ اتنی بڑی گلی تھی جس نے مراد اور راجو کو اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا وہ آشاکے سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت خود میں نہیں پا رہے تھے مگر آج آشاکے نے کس موڑ میں تھی۔ خود کھائی کے انداز میں کہنے لگی۔ ”آپ دونوں کی طرف سے مکمل مایوس ہونے کے بعد میں نے کل اپنے طور پر کوشش شروع کر دی تھی۔ میں نے کئی اخبارات کے ایڈیٹروں سے رابطہ کیا اور 'پوتر اٹھان' کے حوالے سے انہیں اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ پہلے تو کسی ایڈیٹر نے بھی پاپیوں کے خوف سے اسے شائع کرنے کی ہائی نہ بھری مگر جب میں نے انہیں سمجھایا کہ اس سنوری کے شائع ہونے سے ان کے اخبارات کی

جے پور کے پوتر پالنی ☆ 112

اشاعت کئی گنا بڑھ سکتی ہے کیونکہ عام قاری ایسی چٹکارے دار خبریں اور مضامین بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اصرار کیا کہ وہ میرا مکمل نام اور پتہ چھاپ سکتے ہیں تو جے پور کے دونوں بڑے اخبارات کے ایڈیٹر اسے فرنٹ پیج سنوری کے طور پر شائع کرنے پر رضامند ہو گئے۔ میں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی پوری تفصیل ایک مضمون کی شکل میں انہیں فراہم کر دی ہے جو کل کی اشاعت میں یقیناً شائع ہوگی۔

یہ سن کر مراد اور راجیو حیرت کے مارے لنگ سے رہ گئے تھے۔ راجیو کے حلق سے بمشکل نکلا۔ ”آش! یہ تم نے کیا کر دیا۔ تمہیں علم ہے اس کے نتائج تمہارے لیے کتنے سنگین ہوں گے۔“ آشاکا تہقہ خواصا بلند تھا۔ ”مسٹر راجیو! نتائج کی پروا تم جیسے دور اندیش اور سیاست دانوں کو کرتے ہیں۔ مجھ ایسے عام لوگوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے وہ تمام جیون عام آدمی ہی رہتے ہیں اور کسی روز گناہ کی موت مارے جاتے ہیں البتہ تم جیسے دانشوروں کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے۔“

راجیو اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آش! پلیز! بھگوان کے واسطے ہمیں مزید زچ نہ کرو البتہ یہ بتاؤ کہ تمہاری اس طفلانہ حرکت سے پاپی گروہ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟“ آشاکے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”شریمان راجیو جی! مجھے اپنے بے گناہ باپ کی موت کا بدلہ لینا ہے اگر میں قاتلوں کا گریبان نہیں پکڑ سکتی تو کم از کم اتنا تو ضرور کر سکتی ہوں کہ ان کے چروں پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب سر کا دوں تاکہ کوئی دوسرا معصوم ان کی پاکبازی کے جھانسنے میں آکر اپنی زندگی برباد نہ کر بیٹھے۔“

۳ ستمبر ۱۹۷۹ء کے اخبارات نے واقعی جے پور کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ”راجستان پتریکا“ اور ”دینک نوجیوتی“ دونوں اخباروں نے اپنے صفحہ اول پر ”پوتر اشان کی کہانی آشاکا کی زبانی“ کے عنوان سے خصوصی فیچر شائع کیے تھے جس میں آشاکا کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ عوام اور خواص نے اس کو کئی بار پڑھا تھا۔ اگرچہ ہر پڑھنے والے کا مقصد الگ الگ تھا۔ کچھ لوگوں نے محض چٹکارے حاصل کرنے کے لیے جبکہ

جے پور کے پوتر پالنی ☆ 113

باقیوں نے اسے معاشرتی ایسے کی نظر سے دیکھا تھا۔ اکثر لوگ اخبار پڑھنے کے بعد گردہ کی قیادت پر لعنت بھیج رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

دوسری جانب گروہ کے کرنا دھرمائوں کے گھروں میں صف ماتم کچھ گئی۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ گروہ کے قائد دیوی پرشاد تریپاٹھی نے ہنگامی میٹنگ میں اپنے سبھی نائبین کو بلا رکھا تھا اور سب کی کھپائی جاری تھی۔ سبھی ایک دوسرے پر بڑے داری ڈال رہے تھے۔ کانفرنس ہال مچھلی منڈی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اچانک تریپاٹھی کی تیز آواز نے سبھی کو خاموش کر دیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ اس صورت حال کا منطقی تجزیہ کرنے کے بجائے تم سب آپس میں الزام تراشی کر رہے ہو۔ ہماری ہوا اسے اچانک دانقے سے جس طرح اکھڑی ہے اس کے تدارک کے طریقے سوچنے کے بجائے تم نے جوتیوں میں دال پٹنا شروع کر دی ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میرے نائب اس قدر نکتے اور ٹال ٹال ہوں گے۔ اب ہماری بہتری اسی میں ہے کہ آج رات بارہ بجے سے پہلے وہ لڑکی ہمارے قبضے میں ہو تاکہ آئندہ کسی کو ہمارے خلاف ہرزہ سرائی کی جرأت نہ ہو۔ درنہ ایک بار یہ سلسلہ چل نکلا تو کہیں رکنے والا نہیں۔ میرے اس حکم کی اطلاع تمام کارکنوں کو دے دی جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے میٹنگ برخاست کر دی۔

☆=====☆=====☆

مراد اور راجیو کے سامنے آج کے اخبارات موجود تھے۔ راجستان پتریکا اور دینک نوجیوتی میں شائع آشاکا کی سنوری پر سبھی کی نظرس جمی تھیں۔ اس دوران وہاں آشاکا بھی آگئی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں پر اعتماد اور سہرت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ”دیکھا درجن بابو! میں نہ کہتی تھی کہ انسان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔“

مراد کو آشاکا سے اتنے بڑے کام کی توقع نہ تھی۔ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آش! واقعی تم نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہو گا کہ نتائج بھی

ون اردو ڈاٹ کام

ہماری منشا کے مطابق نکلتے ہیں یا نہیں۔

تھوڑی دیر بعد سیوارام بھی آن دھکا تھا۔ ”ارے آشا دیوی! آج تو سارے شہر میں تمہارے ہی چرچے ہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی پیرائے میں تمہارا ذکر کر رہا ہے۔“

آشا کی خوشی دیدنی تھی۔ بچکانہ انداز میں خوش ہوتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”تربا بھی اور اس کے ساتھی اپنا سر پٹت رہے ہوں گے کیونکہ ان کی ساری سناکھ ایک ہی دن میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی ہے۔“

مراد کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ ”آشا! اب تمہیں اپنی حفاظت کا خصوصی دھیان رکھنا ہو گا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ زخمی سانپ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم کچھ روز کے لیے گاندھی نگر شفٹ ہو جاؤ کیونکہ یہ تمہارے گھر سے نسبتاً زیادہ محفوظ ہے۔“ راجیو نے بھی اسے اس بات کا مشورہ دیا تھا، مگر آج اس الز لڑکی میں کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ ”نہیں ارجن بابو! آپ اور راجیو کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں نے تہہ کر لیا ہے کہ اپنی لڑائی خود لڑوں گی۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلتے۔“

راجیو اور مراد نے جب یہ دیکھا کہ وہ ان کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر مراد نے کہا۔ ”اگر تم یہاں ہمارے پاس آنے کے لیے رضامند نہیں تو ایسا کرو کہ سیوارام کو کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھو تاکہ تمہیں کچھ تقویت حاصل رہے۔“ کچھ بحث مباحث کے بعد آشانے یہ تجویز مان لی تھی اور سیوارام کا سائیکل رکشہ دیں چھوڑ کر وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے گئی تھی۔

گھر پہنچتے ہی اسے لگا جیسے سارے شہر کے ٹیلی فون اس کی تلاش میں تھے۔ مختلف اخبارات و جرائد کے نمائندے اس سے تفصیلی انٹرویو کے لیے درخواست کر رہے تھے، مگر وہ سبھی کو ٹال رہی تھی۔ اس دوران اسے سی بی آئی کے ایس پی رام سرودپ کا فون موصول ہوا۔ ”مس آشا! آپ نے اپنے انٹرویو میں ”پوتر پالی سنگھن“ کے خلاف جو

الزامات عائد کیے ہیں ان کی انکوائری کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے تاکہ ایسے گھنٹاؤں نے جرائم کے مرکب افراد کے خلاف قانون حرکت میں آسکے۔“

آشانے خوش دلی سے کہا۔ ”افسوس! میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔“ ایس پی رام سرودپ بولا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے ماتحت عملے کے ہمراہ آپ سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔ آپ مہربانی کر کے گھر پر ہی رہیں۔“

شام پانچ بجے کے قریب باہریل بچی تو سیوارام نے دروازہ کھولا۔ سامنے دو افراد سادہ کپڑوں میں لمبوس تھے۔ وہ تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں انسپکٹر رام دھن ہوں اور یہ سب انسپکٹر دولت رام ہیں۔ ہمیں ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے کماری آشامی کو آفس طلب کیا ہے۔“

سیوارام نے اندر آکر آشا کو بتایا تو وہ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی، مگر سیوارام نے کہا۔ ”آشامی آپ اکیلی نہیں جائیں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“ انسپکٹر دھن مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ چلو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“ باہر کھڑی جیپ میں وہ سبھی سوار ہو گئے، مگر جیپ روانہ ہوتے ہی رام دھن اور دولت رام نے دونوں کی کپٹیوں سے پستول لگا کر سرد آواز میں کہا۔ ”اگر ذرا بھی حرکت کی تو اپنی موت کے خود ذمے دار ہو گے۔ خاموشی سے چپ چاپ بیٹھے رہو۔“

یہ صورت حال دیکھ کر سیوارام کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے، مگر صورت حال ایسی تھی کہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد جیپ پالی گروہ کے مقامی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو رہی تھی جہاں گھسیٹ کر دونوں کو اتارا گیا اور انہیں الگ الگ کمروں میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت آشا کو مراد اور راجیو کا مشورہ یاد آ رہا تھا جسے اس نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، ورنہ شاید وہ موجودہ صورت حال سے بچ جاتی۔

اس قلعے میں ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی جہاں تفریح کے لیے سینما ہاؤس سے لے کر مطالعے کے لیے شاندار لائبریری بھی موجود تھی۔ البتہ شوہا ہر دم اس کے ساتھ لگی رہتی۔ اسے اپنے اس دم چٹلے سے جڑی ہو گئی تھی مگر مجبوراً اسے برداشت کر رہی تھی وہ کھانا زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں کھاتی اگرچہ قلعے میں ایک شاندار میس بھی تھا۔

اس روز اس نے رات کا کھانا میں میں کھانے کا ارادہ کیا۔ حسب معمول شوہا اس کے ساتھ تھی۔ بانو اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جہانہ عورت کسی اپنایت کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جڑی ہوئی بلکہ اس کی نگرانی پر مامور ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بانو نے شوہا کو مخاطب کیا۔ ”دیدی! تھوڑا گھومنے کو جی چاہ رہا ہے اگر آپ اجازت دیں تو.....“

شوہا اس پر صدقے واری ہوتے ہوئے بول۔ ”ہاں ہاں چلو ہم اوپر چھت پر کچھ دیر چمٹ قدمی کر لیتے ہیں۔“ پُر بیچ میڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ قلعے کی چھت پر پہنچیں۔ گرمی کا موسم تھا اس لیے کھلی چھت پر گھومنا بانو کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دور نشیب میں جے پور شہر کی روشنیاں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ چھت پر جانے سے بانو کا مقصد محض تفریح نہیں تھا بلکہ وہ اس عمارت اور گرد و لواح کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتی تھی۔

قلعہ کی چھت کے مشرقی جانب دس فٹ اونچی دیوار سے چھت کو دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ چھت کا زیادہ بڑا حصہ تو وہی تھا جہاں وہ گھوم پھر رہی تھیں البتہ تقریباً چھت کے ایک چوتھائی حصے کو دیوار کے ذریعہ الگ کر دیا گیا تھا۔ دیوار کے ایک کونے میں سات فٹ طول و عرض کا سلاخوں والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں میں سے چھت کا دوسرا حصہ بھی صاف نظر آ رہا تھا جو چند کمروں کی عمارت پر مشتمل تھا۔

بانو دروازے کے اس پار دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”دیدنی! دیوار کے اس پار والی عمارت میں کیا ہے۔ کیوں نہ ادھر کا بھی چکر لگا آئیں؟“ شو بھا چند لمبے سوچنے کے بعد کہنے لگی۔ ”ساتنی! بھگوان نہ کرے ہم ادھر جائیں۔“ بانو یہ سن کر حیران سی ہو گئی تھی۔

”کیوں دیدی! ادھر ایسی کون سی بات ہے جو آپ یوں گھبرا سی گئی ہیں۔“

شوبھا کے لیے میں ہلکی سے کیکپاٹ تھی۔ ”شناختی ٹھاکر! کوئی دوسری بات کرو۔ ادھر جانے والے لوٹ کر واپس نہیں آتے اور اگر ابھی جائیں تو ان کا جیون موت سے بدتر ہو جاتا ہے۔“ بانو کچھ جڑتے ہوئے بولی۔ ”شوبھاجی! آپ معمولی سی بات کو پراسرار بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ بھلا ایسی بھی کیا بات ہوئی کہ چند گز ادھر والی عمارت میں جانے والے واپس نہیں آتے۔ کیا وہاں کسی آسیب کا سایہ ہے؟“

شوبھا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ”مس ٹھاکر! تم خواہ مخواہ اصرار کر رہی تو سنو وہ عمارت کسی بھوت نگر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہاں سب لوگ اس جگہ کو ”زک“ (دوزخ) کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں کا ماحول وہی ہے جو رامائن اور گیتا کے مطابق زک کا ہے۔“ بانو نے ابھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شوبھاجی! مجھے تو آپ کی بات بالکل سمجھ نہیں آرہی۔ پتہ نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

شوبھا کچھ جھنجھلا سی گئی تھی۔ ”صاف لفظوں میں سننا چاہتی ہو تو سنو۔ وہ ایک نارچر سیل اور ایسی عقوبت گاہ ہے جس کے تصور سے ہی جھرجھری آجاتی ہے۔ گردہ کے مخالفین اور غداروں کو وہاں رکھا جاتا ہے جہاں دنیا بھر کی دہشت کے سبھی سامان موجود ہیں۔“

بانو بھی پوری طرح انکوائری کے موڈ میں تھی۔ ”کیا آپ اس جگہ کو دیکھ چکی ہیں۔“ شوبھا اس پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”ہاں میں اسے دیکھ چکی ہوں بلکہ گردہ کے ہر رکن کو ایک بار وہاں کا درشن ضرور کرایا جاتا ہے تاکہ کسی کے ذہن میں کبھی بغاوت یا غداری کا خیال نہ آئے۔ تمہاری خواہش ہے تو ابھی تمہیں بھی دکھا دیتی ہوں۔ تم چند منٹ یہاں ٹھہرو میں گپتاجی سے چابی اور اجازت لے کر آتی ہوں۔“

بانو کے جواب کے انتظار کے بغیر وہ نیچے اتر گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھامے وہ واپس آئی اور درمیانی دروازہ کھول دیا۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر

واقعی چھوٹی سی عمارت تک وہ دونوں پہنچیں۔ عمارت کے چاروں جانب لوہے کی مضبوط جالیاں لگی تھیں۔ اینٹ یا پتھر کی دیوار نہ تھی۔ ان جالیوں کی اندرونی جانب شفاف شیشے کی دیواریں تھیں۔ بانو نے جالی کے ساتھ آنکھیں لگا کر اندر دیکھا تو خوف کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گئی۔

اندر کمرے میں تیز روشنی کا بندوبست تھا جس کی وجہ سے ہر چیز صاف واضح نظر آرہی تھی اس چھوٹی سی عمارت کو شیشے کے چھوٹے چھوٹے کینوں سے کئی حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ ہر کین میں مختلف قسم کے حشرات الارض شیشے کے فرش اور دیواروں کے ساتھ آزادانہ رینگ رہے تھے۔ ان میں بڑے اژدھوں سے لے کر چھوٹے چمکیلے سانپ تک سبھی موجود تھے جو اپنی پتلی یا سرخ زبانوں سے شیشے کی دیواروں کو چاٹ رہے تھے۔ ایک کین میں مکروہ شکل کی چھپکلیاں تھیں جبکہ دوسری جانب موٹے چوہے اور بچھو ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے تھے۔ چھوٹی بڑی چوہنیوں سے لے کر سانپ اور بچھو اندر آزادانہ گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی کراہت اور دہشت کا عجب سا احساس ہوتا تھا۔ بانو گھوم کر دوسری جانب شیشے کی دیوار تک پہنچی تو اندر جھانکتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی کیونکہ سامنے ہی دو مختلف کینوں میں ایک مرد اور عورت بند تھے۔ وہ اپنے کین کے فرش پر بیٹھے بے بسی سے اپنے چاروں جانب گھومنے والے حشرات الارض کو تک رہے تھے۔ ان دونوں کی آنکھیں خوف اور دہشت کے مارے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بالکل بے حس و حرکت تھے جس سے گمان گزرتا تھا کہ شاید ان کی ارواح جسموں کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔

خود بانو کی حالت ایک لمحے میں ہی زندہ لاش جیسی ہو گئی تھی کیونکہ اس نے آشا اور سیوا رام کو پچپانے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اسے یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب لگ رہا تھا۔

بانو کی دہشت ناک چیخ عمارت کے نچلے حصے تک پہنچی تھی۔ نیچے سے کئی افراد

دوڑتے ہوئے اوپر آئے۔ ان میں گیتا جی بھی شامل تھے۔ باقی لوگ تو کچھ دور ہی رک گئے، البتہ گیتا جی تیز قدموں سے بانو اور شوبھا کی جانب آگے بڑھے۔ قریب پہنچ کر وہ غالباً صورت حال کو بھانپ گئے تھے اس لیے ان کے قدموں کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی۔ نزدیک آکر بولے۔ ”گیتا جی! کوئی خاص بات نہیں، شانتی جی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔“

گیتا کے لہجے میں نرمی تھی۔ ”مس ٹھاکرا اس میں گھبرانے والی کون سی بات ہے جو آپ یوں چلائے لگیں۔“ بانو کے اعصاب ابھی تک نارمل نہیں ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں ابھی تک آشادور سیوارام پر جمی تھیں۔ ”مہاراج! یہ عورت اور مرد کون ہیں اور انہیں یہاں کیوں بند کیا گیا ہے۔ یہ لوگ زندہ بھی ہیں یا.....“ یہ کہہ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

گیتا ساری بات سمجھ گیا تھا، اور اس کی آواز میں شکستگی کی جھلک نمایاں تھی۔ ”شانتی جی! آپ نے تو ایک ہی سانس میں بہت سارے سوال کر ڈالے۔ لگتا ہے آپ خاصی کمزور اعصاب کی مالک ہیں۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ بانو کی آواز ابھی تک لرز رہی تھی۔ ”مگر یہ ہیں کون لوگ اور کیا وہ مرچکے ہیں؟“ گیتا اس کی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”شانتی دیوی! آپ ان لوگوں کی چٹانہ کریں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایسے ڈھیٹ لوگ یوں جلدی سے مرنے والے نہیں اور یوں بھی میں انہیں اتنی آسانی سے مرنے بھی نہیں دوں گ۔ کسی کو ایک دم جان سے مار دینا بھی کوئی سزا ہے۔ ابھی تو الکی سی سرزنش کی گئی ہے۔“

پھر وہ شوبھا کی جانب مڑا۔ ”شوبھا! نیچے سے بھرنگ کو بلا کر کہو کہ ان دونوں کو نکال کر نیچے لے جائے اور انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ لگتا ہے خوف سے بے ہوش ہو گئے ہیں اور ہاں اسے یہ بھی کہنا کہ فی الحال ان دونوں کے آرام اور خوراک کا

بھی دھیان رکھے۔ ان سے سب کچھ اگلوئے بغیر انہیں مرنے دینا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ شوبھا حکم کی تعمیل کے لیے نیچے چلی گئی، مگر بانو کی نگاہوں کا مرکز ابھی تک وہی درلوں تھے۔ وہ گیتا کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ ”شریمان جی! اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی بتادیں کہ ان دونوں سے کون سا پرادھ (جرم) سرزد ہوا ہے؟“

گیتا مہاراج نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا اور بانو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہلا۔ ”ارے بھئی! تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ یہاں رہو گی تو دھیرے دھیرے ساری صورت حال سے باخبر ہو جاؤ گی۔ ویسے تم بغض ہو تو میں بتا دیتا ہوں کہ انہیں گروہ سے غداری کی سزا ملی ہے۔“ بانو نے اپنی سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔ ”مہاراج! ابھی تک میرے بچے کچھ نہیں پڑا۔ ذرا کھل کر بتائیں تو شاید سمجھ میں آجائے۔“

اس نے عجیب سے انداز میں بانو کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی شیطانیت دیکھ کر بانو کسی قدر گھبرا سی گئی تھی۔ گیتا کا لہجہ سرسری سا تھا۔ ”شانتی! ان بکھیروں میں پڑ کر اپنی توانائی مت ضائع کرو۔ کہہ دو یا یہ ہمارے غدار ہیں۔ یہ لڑکی بے تم بڑی معصوم سمجھ رہی ہو، یہ پہلے ہمارے گروہ کی رکن تھی، پھر اس کے ذہن میں ہیرود بننے کا خیال آیا اور یہاں سے بھاگ نکلی۔“ بانو کچھ اور پریشان سی ہو گئی۔ ”تو کیا اس کا جرم یہی ہے کہ یہاں سے بھاگ نکلی تھی؟“ گیتا نے مزید وضاحت کی۔ ”نہیں اس کا جرم بہت بڑا ہے۔ اس حرامزادی نے جانے کس کی شہ پر کل کے اخبار میں ہماری تعظیم پر کچھڑ اچھالا ہے۔ خصوصاً پوتر اشران کے حوالے سے اس نے بہت جھوٹ بکا ہے۔ تم خود ہی بتاؤ پوتر اشران میں تمہیں کوئی برائی محسوس ہوئی۔ یہ اشران تو تن اور من دونوں کو پاکیزگی مہیا کرتا ہے۔“

یہ سن کر بانو کی تیوریوں کے بل گھرے ہو گئے مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ گیتا نے اپنی بات مزید آگے بڑھائی۔ ”ویسے اچھا ہی ہوا تم نے آج یہ منظر دیکھ لیا۔ گروہ میں ہر

نے شامل ہونے والے کو اس قسم کا منظر ضرور دکھایا جاتا ہے تاکہ آگے چل کر اس کے دماغ میں کوئی خناس نہ آئے پائے دیے تم سے مجھے یہ امید نہیں۔"

بانو جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس دوران بزرگ تین ساتھیوں سمیت دو اسٹریچر لے کر اُمید ان چاروں نے دوسری جانب سے کمرے کا دروازہ کھولا اور آشا اور سیوا رام کو اسٹریچر پر ڈال کر نیچے لے گئے۔ بانو ان دونوں کو نیچے لے جاتے دیکھ کر بہت دکھی ہوئی کیونکہ اس نے چند روز ان کے ہمراہ اچھے دوستوں کی طرح گزارے تھے۔ ان کے جانے کے بعد گپتا بانو کی جانب متوجہ ہوا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم نیچے جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو تاکہ تمہارے اعصاب کو سکون مل سکے۔" بانو اس کے مشورے میں پوشیدہ حکم کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی، لہذا بو جھل قدموں سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب چلنے لگی۔

اپنے کمرے میں جا کر وہ اوندھے منہ بستر پر گر پڑی اور اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ وہ درحقیقت بہت خوفزدہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں آکر وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور آہستہ قدموں سے شوبھا اس کی طرف بڑھی اور نرم لہجے میں بولی۔ "شانتی! یوں اپنا سن چھوٹا نہ کرو، تم نے اپنے لیے جس راہ کا انتخاب کیا ہے، اس میں تو ایسے مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔"

بانو سر اٹھا کر خاصی دیر خاموش نگاہوں سے شوبھا کو دیکھتی رہی، پھر خود کلائی کے انداز میں بڑبڑائی۔ "شوبھا دیدی! کیا آپ واقعی اتنی سخت دل ہیں کہ اس قسم کے غیر انسانی ظلم ہوتے دیکھ کر آپ کو دکھ محسوس نہیں ہوتا۔" شوبھا اپنے قدرے بھاری بھر کم وجود کو سنبھالتے ہوئے اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ "شانتی! پلیز آئندہ سے تم مجھے دیدی مت کہنا کرو کیونکہ ایسے شبد مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

بانو قدرے حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ "مگر شوبھا جی! یہ لفظ اتنا برا تو نہیں جو آپ

ناراض ہو گئی ہیں۔" شوبھا کے لہجے میں عجیب سی کڑواہٹ تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہ لفظ برا نہیں مگر مجھے ہر طرح کے رشتے نامتوں سے نفرت ہو گئی ہے اور میں ان پر یقین نہیں رکھتی۔"

وہ اپنی پریشانی بھول کر ایک عجیب سے تجسس میں مبتلا ہو گئی تھی۔ "شوبھا دیدی! لگتا ہے کہ آپ بھی اندر سے بری طرح ٹوٹ چکی ہیں اور اپنے اندر طوفان چھپائے بیٹھی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ سنا ہے اس طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

شوبھا کچھ دیر اپنی سازشی کے پلو سے کھیلتی رہی اور جواب میں کچھ نہ بولی۔ پھر انہی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد بانو کے سامنے صوفے کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ بانو اس کی آنکھوں میں اتاری ہوئی نمی سے باخبر تھی، مگر وہ خاموشی سے اس کے بولنے کے انتظار میں رہی۔ کمرے میں خاصی دیر تک سوگوار سناٹا طاری رہا۔ اس خاموشی کو شوبھا کی مدھم آواز ہی نے ختم کیا۔

"میں ادرہ پور کے ایک متوسط برہمن گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد۔ برادری کی روایت سے ہٹ کر انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی رہی۔ "ہندو متھالوجی" میں ماسٹرز کرنے کے بعد مجھے راجستھان یونیورسٹی میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ میرے خیالات شروع ہی سے دھارمک (مذہبی) تھے اور میں زمانہ طالب علمی ہی سے "آر ایس ایس" سے بہت متاثر تھی اور اس کے سٹوڈنٹس ونگ میں نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد مجھے ملازمت مل گئی۔ یونیورسٹی میں پڑھاتے مجھے سات سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے بابا پتا نے بہت زور لگایا کہ میں شادی کر لوں مگر میرے ذہن پر ہندو جاتی (قوم) کی بہتری کا بھوت سوار تھا۔ اپنا سارا جیون اس مقصد کے لئے وقف کر دینا چاہتی تھی، انہی دنوں میری کلاس میں ایم اے کے پہلے سال میں ایک طالب علم پر بھودیاں

داخل ہوا۔ واجبی سی شکل کے اس نوجوان میں جانے کیا بات تھی کہ میں پہلے ہی روز سے اس سے متاثر ہو گئی۔ بہت غریب گھرانے کا ہونے کے باوجود کلاس میں نمایاں رہتا۔ اس کا باپ جے پور کے ہنومان مندر میں معمولی سا پجاری تھا۔

”وہ عمر میں مجھ سے تقریباً دس برس چھوٹا تھا۔ عمر کے اس تفاوت کے باوجود میں اس کی جانب کبھی پھٹی گئی۔ دھیرے دھیرے وہ بھی میری جانب مائل ہونے لگا۔ ایم اے کے امتحان کے فوراً بعد ہم دونوں نے شادی کر لی اور وہ میرے ہی گھر میں رہنے لگا۔ میں نے اپنی ملازمت کے دوران شاستری عمر میں خاصا خوبصورت مکان بنا لیا تھا۔ شادی کے بعد اس کا پردہست باپ بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ میرے پتی پر بھودیال اور اس کے باپ دشنو دیال نے میرے ماں باپ کو صلاح دی کہ اب ان دونوں کو دنیا داری چھوڑ کر کاشی ہرردار اور جگن ناتھ کی یاترا کر لینی چاہیے۔ میرے ماما پتا ”تیرتھ یاترا“ مقدس مقامات کی زیارت کو ایسے نکلے کہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

”میرے پتی اور سرکارویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا، لیکن میرے ماں باپ کے تیرتھ یاترا جانے کے بعد ان کے سلوک میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ دونوں بار بار مجھے زیادہ عمر ہونے کا احساس دلاتے۔ ایک بار میرے پتی پر بھودیال نے صاف لفظوں میں کہہ بھی دیا کہ میں اس کے قابل نہیں کیونکہ میں تو اس کی ماں لگتی ہوں۔ یہ سن کر مجھ پر ایک قیامت سی گزر گئی۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں باپ بیٹے نے مجھ پر زور دیا کہ میں ملازمت چھوڑ دوں، انیس میرے چال چلن پر شبہ ہے۔ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد مجھے گھر میں عملاً قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد پر بھودیال کے باپ دشنو دیال نے بھی زبردستی میرے ساتھ تعلقات قائم کر لئے اور یہ سب کچھ میرے پتی کے علم میں تھا۔ یوں میں ”دیشیاؤں“ سے بدتر زندگی گزارنے لگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کسی حد تک اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اسی دوران یہ حادثہ پیش آیا کہ میں نے چھپ کر ان دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو سن لی۔ وہ مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اگلی ہی

صبح میں نے پھل کرنے کا فیصلہ کیا اور ناشتے میں زہر ملا کر دونوں کو کھلادیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ دونوں ”زک سدھار“ (جنم رسید) گئے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ اس دہرے قتل کا سیدھا الزام مجھ پر آئے گا، چنانچہ میں نے ”پوتر پانی“ گردہ سے رابطہ قائم کیا اور اپنی ساری کہانی سنا کر ان سے مدد کی درخواست کی۔ یوں میں ان کی پناہ میں چلی آئی۔ تب سے میں گردہ کی تمام کارروائیوں میں بھرپور حصہ لے رہی ہوں۔ گردہ میں شامل ہونے کے بعد پتہ چلا کہ اس تنظیم نے سماجی خدمات کا محض لبادہ اوڑھ رکھا ہے، اس کا اصل کام حکومت کے ان مخالفین کا تیا پانچ کرنا ہے جن کے خلاف حکومت رائے عامہ کے خوف سے کوئی قانونی ایکشن نہیں لے سکتی۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ممالک خصوصاً پاکستان میں اس تنظیم کی کارروائیوں میں میری مدد شامل ہوتی ہے۔“

یہ کہہ کر شوہا خاموش ہو گئی۔ اس کی طویل کہانی کے دوران بانو نے کوئی مداخلت نہیں کی اور پورے انسہاک سے اس کی جانب متوجہ رہی، مگر گفتگو کے آخری حصے نے اسے چونکا دیا۔ ”شوہا دیدی! آپ کی داستان واقعی انساک ہے، مگر کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں، مثلاً آپ کے بقول یہ تنظیم پاکستان کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث ہے، بھلا اس گردہ کو پاکستان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“

اس کی بات سن کر شوہا غلاب توقع نہس پڑی۔ ”اے شانتی! تمہیں علم ہونا چاہئے کہ ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی عورت دشمن دیل کو کتنا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں خود آج تک کبھی پاکستان نہیں گئی، مگر وہاں دہشت گردی کی کارروائیوں کے سرخیل اکثر و بیشتر یہاں آتے رہتے ہیں اور ان کی ”خاطر تواضع“ میری ہی ذمہ داری ہے۔ سیوا کے دوران میں انتہائی مہارت سے ان کے ذہنوں میں پاکستان مخالف جذبات کو مزید پختہ کرتی ہوں۔ میرے علاوہ بھی کئی دوسری ہندو خواتین اس شبہ کام کا ایک حصہ ہیں۔“

بانو کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شوہا سے مخاطب ہوئی۔ ”شوہا جی! آپ کی بات

چیت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی موجودہ حیثیت سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ ”شوہا کا لہجہ یک لخت اکھڑ سا گیا۔“ میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے دھرم اور دیش کی خدمت کر رہی ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔“

☆=====☆=====☆

مراد اور راجیو کو آشا اور سیوا رام کی اچانک گمشدگی نے ہراساں کر دیا تھا۔ شام کے دھندلکے میں وہ ایک ریسٹورنٹ کے نسبتاً ویران گوشے میں بیٹھے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ”مسٹر شرما! آپ ہی کچھ بتائیں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اب تک آپ کے مشورے بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔“ مراد خلا میں نظریں جمائے یوں لالعلقی سے بیٹھا تھا جیسے اس نے راجیو کی بات سنی ہی نہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آیا اور اس نے آہستگی سے کہا۔ ”راجیو! یہ بات طے ہے کہ انہیں پانی گروہ ہی نے اغوا کیا ہے۔ دوسری جانب شانتی سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہو سکا اور شاید ہم دونوں اس پوزیشن میں نہیں کہ تن تنہا اس گروہ سے ٹکرا کر اپنے ساتھیوں کو رہا کر سکیں۔“

راجیو دھیمی سی آواز میں بڑبڑایا۔ ”میں آپ سے متفق ہوں کہ ہم دونوں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، البتہ کرئل بھوانی سنگھ کی مدد سے کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ مراد نے پہلے کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، ہمیں ان سے مدد لینی ہوگی مگر اس کے عوض وہ بھی یقیناً چاہیں گے کہ انتخابی مسم میں ہم ان کے لئے کوئی ٹھوس کام کر سکیں۔ مھض زبانی جمع خرچ سے ہم ان کی عملی ہمدردی حاصل کرنے سے رہے۔ ہمیں پہلے کچھ کارکردگی دکھانی پڑے گی۔“

مراد اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آئیں میرے ساتھ۔“ راجیو کے چہرے پر حیرانی کے آثار گہرے تھے وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب کہاں کا پروگرام ہے۔“ راجیو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ خاموشی سے میرے ساتھ چلیں۔ ہم ابھی کرئل صاحب سے ملیں گے۔ اس مرحلے میں معمولی سی تاخیر بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم

دونوں ان کے ہتھے چڑھ جائیں اور میں اڑنے سے پہلے ہرگز گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔“ وہ کرئل بھوانی سنگھ کی رہائش گاہ راج نواس پہنچ گئے اور مسلسل ہارن کی آواز سن کر رہانے اس قلعہ نما عمارت کا دروازہ کھولا اور راجیو گاڑی کو سیدھا پورچ میں لے گیا۔ انہیں چند لمحوں بعد ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا جہاں خلاف توقع کرئل بھوانی سنگھ اور ڈاکٹر چند رہمان پہلے سے ان کے منتظر تھے

رکشی سلام دعا کے بعد کرئل کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ”اچھا ہوا تم لوگ خود آگئے، کچھ دیر پہلے تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ سگار سلگانے لگا۔ اب شاید ڈاکٹر چند رہمان کی باری تھی۔ ”مسٹر شرما! اس روز تو آپ دونوں نے بڑے دعوے کئے تھے اور ہمیں بہت سبب بربط دکھائے تھے، مگر انتخابی شیڈول کے اعلان ہونے کے باوجود تم کچھ بھی نہیں کر سکے۔“

مراد کی آواز اعتماد سے بھرپور تھی۔ ”ڈاکٹر! ہم اسی سلسلے میں خود حاضر ہوئے ہیں۔ کل صبح راجیو جی بھی جے پور سے لوک بھیا کی نشست کے لئے اپنے کانفرنس نامزدگی داخل کرائیں گے۔“ یہ سن کر کرئل، ڈاکٹر اور راجیو تقریباً اچھل پڑے۔ راجیو تدرے ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”مسٹر ارجن شرما! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کرئل بھوانی سنگھ کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کا سوچوں؟ کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ مراد کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ ”مسٹر راجیو! پہلے میری بات مکمل تو ہونے دیں۔ آپ کل صبح پریس کانفرنس کریں گے جس میں پوتر پانی گروہ کے فارورڈ بلاک کی تشکیل کا اعلان کریں گے۔ آپ بتائیں گے کہ اس کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی بنا پر آپ کو فارورڈ بلاک بنانا پڑا تاکہ عوام اصل حقائق سے آگاہ ہو سکیں۔ آپ اپنے لئے ”پوتر گروہ“ کا نام استعمال کریں گے جبکہ تریبا نھی گردپ کو ”پانی گروہ“ کے نام سے پکاریں گے۔“

کرئل اور چند رہمان دخل دیے بغیر ان کی باتیں پوری دلچسپی سے سن رہے تھے۔

مراد نے چائے کا کپ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلا فائدہ یہ ہو گا کہ سبھی اخبارات ہمارے الزامات کو اپنے صفحات میں نمایاں جگہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر اس گروہ نے ہمیں ختم کرنے کا پروگرام بنایا ہے تو کم از کم ایکشن ختم ہونے تک وہ اپنے اس ارادے سے باز رہے گا کیونکہ اس دوران ہماری موت یا گمشدگی کا سیدھا الزام ان پر آئے گا اور موجودہ انتخابی فضا میں وہ لوگ یقیناً اس الزام کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس پوزی صورت حال کا بالواسطہ فائدہ کرمل بھوانی سنگھ جی کو پہنچے گا۔“

اس کی بات مکمل ہوئی تو کرمل کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”راجیو! مسزارجن شرما کی تجویز میں بڑا دزن ہے۔ تمہیں اس بات پر عمل کرنا چاہیے۔“ ڈاکٹر چندر بھان نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ وہ چاروں رات گئے تک صلاح مشوروں میں ہمہ تن مصروف رہے۔

اور اگلی سہ پہر ایک مقامی ہوٹل میں بلائی ہوئی پریس کانفرنس میں راجیو پورے دھڑلے سے تریپاشی گروپ پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ اکثر صحافی دانتوں میں قلم دبائے سوچ رہے تھے کہ اس زبردست سنوری کو اپنے اخباروں میں کس طرح نمایاں طور سے چھاپا جاسکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس پریس کانفرنس کی خبر پورے جے پور میں پھیل گئی۔ گروہ کے سرکردہ افراد نے اخبارات کے دفاتر فون کر کے اس کی اشاعت روکنے کی بھرپور کوشش کی، مگر وہ ناکام رہے۔ اگلے روز سبھی اخباروں نے خوب نمک مرچ لگا کر راجیو کے سارے الزامات شائع کر ڈالے جن سے جے پور کی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ یہ پریس کانفرنس ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء کے اخبارات میں چھپی تھی۔

جے پور کے نواح میں پوترپالی گروہ کے مقامی بینڈ کوادرٹ کا مول بڑا کشیدہ تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے کچھا کچھا سا نظر آ رہا تھا۔ کانفرنس روم کی طویل سیز کے گرد چند رہ افراد بیٹھے تھے جن کے سامنے آج کے اخبارات پڑے تھے۔

دائیں جانب درمیانی کرسی خالی تھی۔ کانفرنس روم کا دروازہ کھلا اور گروہ کا سربراہ دیوی پرشاد تریپاشی اندر داخل ہوا۔ وہ درمیانی قدم و قامت کا بارعب شخص تھا جس کی عمر ساٹھ کے پینے میں تھی۔ اسے دیکھ کر سبھی لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے۔

تریپاشی کے بیٹھے ہی میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ رسمی کارروائی کے بعد گیتا جی نے مختصر الفاظ میں حاضرین کو اس ہنگامی اجلاس کے ایجنڈے سے آگاہ کیا۔ ”پچھلے چند ہفتوں سے کچھ حلقے بڑے منظم انداز سے تنظیم کو بدنام کرنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں، آپ ان سے بے خبر نہیں ہوں گے لہذا.....“ ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ تریپاشی نے مائیک اٹھا کر اپنے آگے کر لیا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”مسز گیتا! بند کرو اپنی یہ رسمی بکواس۔ اس قسم کی لفاظی سے تم اپنی غلطیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔“ گیتا کا چہرہ بھری محفل میں اپنی توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

تریپاشی نے گیتا کے چہرے سے اس کے اندر دنی جذبات کا اندازہ لگالیا تھا اور وہ کسی قدر نرم آواز میں گویا ہوا۔ ”آپ سبھی لوگ موجودہ صورت حال سے واقف ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر دوسری بار کھلے عام ہم پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ اس کے تدارک کا اگر فوری بندوبست نہ کیا گیا تو ہمارے لئے بہت سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور ہماری ہوا اکھڑ جائے گی۔“

گیتا کے برابر بیٹھا ہوا ایک محکم عظیم شخص بولا۔ ”مسارج! ہم اس لڑکی آشاکو تو پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ اسے فوری طور پر موت کی نیند سلا کر کسی پبلک مقام پر پھینک دیا جائے تاکہ اس کے ہمدردوں کو احساس ہو جائے کہ وہ بھی اس انجام سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ راجیو نامی شخص کو بھی فوری طور پر ختم کرنے کے احکام صادر فرمائیں۔“

چند افراد اس کی باتوں پر تائید کے طور پر سر ہلاتے رہے۔ تریپاشی نے کچھ دیر مزید خاموش رہنے کے بعد سبھی کے چروں پر نظر دوڑائی۔ اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

”ہاں تو مسٹر داس! تمہارے خیال میں مسئلے کا حل یہی ہے کہ فوری طور پر راجپوت کو ختم کر دیا جائے۔ ابے گدھے! مجھے اچھی طرح علم ہے کہ اس نے لوک سبھا الیکشن میں حصہ لینے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے۔ اسے قتل کر دینے سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ الیکشن کا جائزہ لینے کے لیے آنے والے غیر ملکی مبصرین اور صحافی اس واقعے کو عجیب عجیب رنگ دیں گے اور ہم تک آپہنچیں گے۔“

پھر وہ ایک دوسرے شخص سے مخاطب ہوا۔ ”گیتا تم فوری طور پر راجپوت اور اس کے ساتھیوں کے گرد گھیرا تنگ کر دو۔ یہ پتہ فوری طور پر لگاؤ کہ راجپوت کن لوگوں کی شب پر یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“

گیتا کا لہجہ مودب تھا، اس نے کہا۔ ”چیف! اس کے بڑے حامی کرل بھوانی سنگھ اور ڈاکٹر چندر بھان ہیں اور ان کی وجہ سے ”کانگریس آئی“ کی مقامی قیادت ہمارے خلاف راجپوت کے کندھے استعمال کر رہی ہے، آپ کے حکم کے مطابق آج سے ان لوگوں پر خصوصی نظر رکھی جائے گی۔“ چند مزید تجاویز پر بحث کرنے کے بعد اجلاس ختم کر دیا گیا۔ اسی شام گیتا نے بانو کو اپنے پاس طلب کیا۔ وہ حیران تھی کہ آج اس نے اسے اپنے آفس کے بجائے دوسرے کمرے میں بلایا ہے۔ کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے اسے نمسکار کیا۔ وہ کچھ دیر بانو کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ”سن شنائی ٹھاکرا! میرا خیال ہے کہ آپ نے خاصا آرام کر لیا ہے۔ اب کچھ کام کی باتیں ہو جانی چاہئیں۔“ بانو تو خود یہی چاہتی تھی۔ ”جی ہاں! میں خود بھی نارغ رہ کر اکتا گئی ہوں۔“

”شنائی دیوی! آپ کو ایک شخص ڈاکٹر چندر بھان کا پورا اعتماد حاصل کرنا ہے۔“

بانو عام سے سبجے میں بولی۔ ”ٹھیک ہے، آپ معلومات مہیا کیجئے، میری رہنمائی کرتے رہئے، میں یہ کام کر لوں گی۔“ گیتا نے کہا۔ ”مزید گفتگو سے پہلے یہ وڈیو کیسٹ دیکھ لیا جائے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ سامنے نصب ٹیلی ویژن پر چند لمبے آڑھی ترچھی کپڑیں ابھرتی رہیں اور پھر تصاویر واضح ہوتی چلی گئیں۔

بانو یہ دیکھ کر غصے اور کرب سے کانپنے لگی کہ اس کے ”پوتر ایشن“ کے دوران مختلف زادیوں سے اس کے جسم کی تصویریں اس طرح کمپوز کی گئی تھیں کہ فاشی کا ایک منظر ابھرتا چلا گیا۔ وہ گیتا کا منہ نوچ لیتا چاہتی تھی۔

گیتا کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے انار پڑھاؤ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”شنائی دیوی! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس فلم کو تمہارے خلاف صرف اسی وقت استعمال کیا جائے گا جب تم ہمارے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کرو گی۔ یہ محض ایک احتیاطی تدبیر ہے ورنہ تم تو اس وقت گردہ کی انتہائی قابل احترام کارکن ہو۔ اس مشن کے دوران تمہاری ہر طرح حفاظت کی جائے گی۔ ہمارے آدمی ہر وقت تمہارے آس پاس ہوں گے۔ مجھے امید ہے تم ہماری توقعات کو نہیں نہیں پہنچاؤ گی۔ دوسری صورت میں تمہارا حشر آتشا سے بھی برا ہوگا۔“

گیتا کے آدمیوں نے چند ہی گھنٹے بعد شو بھا اور بانو کو تلک نگر کے ایک خوبصورت مکان میں پہنچا دیا۔ یہ متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ چاروں طرف چھوٹے مگر خوبصورت کوٹھیں نما مکانات بنے ہوئے تھے۔ بانو یہ بھی جانتی تھی کہ شو بھا کو اس کی نگرانی کے لیے ساتھ رکھا گیا ہے۔ انہیں نئے ملازلی کی ایک ”ماروٹی“ گاڑی ڈرائیور کے ساتھ فراہم کر دی گئی تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر ڈاکٹر چندر بھان کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔

اس وقت وہ شو بھا کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف تھی۔ وہ پوتر پالی گردہ کے ہیڈ کوارٹر سے باہر آنے پر بہت خوش تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب اسے مراد سے رابطہ کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی جہاں اوائل نومبر کی تھکی تھکی سی دھوپ اور بے جان مناظر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

سہ پہر کی چائے کے بعد اس نے ڈاکٹر چندر بھان کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب

☆=====☆=====☆

مراد اور راجیو بھوانی سنگھ کی رہائش گاہ پر استغابی حکمت عملی طے کرنے میں مصروف تھے۔ فیصلہ ہوا کہ راجیو آخری لمحات میں بھوانی سنگھ کے حق میں الیکشن سے دست بردار ہو جائے گا تاکہ کرمل بھوانی سنگھ کے حق میں ایک نفسیاتی برتری کی نفا قائم ہو جائے۔ اچانک جیسے اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”میں ایک بات آپ لوگوں کو بتانا بھول گیا۔ کل شام پوتر پالی گروہ کی ایک کارکن عورت میرے پاس آئی تھی اور اس نے مجھے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔“

راجیو اور مراد پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ چندر بھان اپنی بات کی وضاحت کرنے لگے۔ ”اس کا نام شانتی ٹھاکر ہے اور.....“ بانو کا نام سن کر مراد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اپنے مزید اطمینان کے لیے وہ کہنے لگے۔ ”چندر بھان جی! ہو سکتا ہے وہ گروہ کی ستالی ہوئی ہو۔ وہ ہم لوگوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس عورت کو ہماری موجودگی میں بلائیں تاکہ راجیو جان سکے کہ اس کی بیان کردہ کمائی میں کہاں تک صداقت ہے۔“

واپس گھر آتے ہوئے مراد اور راجیو خاصے مطمئن تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بانو کے ذریعے انہیں آشا اور سیوا رام کا معہ حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے چندر بھان نے فون پر ان دونوں کو لُچ کی دعوت دی جس پر شانتی بھی مدعو تھی۔

مراد اور راجیو چندر بھان کے ہاں ٹھیک ڈیزھ بجے پہنچ گئے۔ اسی وقت گیٹ سے سفید رنگ کی کار اندر داخل ہوئی اور وہ لمحہ آن پہنچا جس کا مراد کو شدت سے انتظار تھا۔ گاڑی سے اتر کر جوئی بانو برآمدے میں داخل ہوئی اس کی نگاہیں کچھ دیر کے لیے ٹھٹک سی گئیں مگر چند ہی ثانیوں میں اس نے اپنے اوپر تابو پالیا اور پُر اعتماد قدموں سے ان کی طرف بڑھی۔

چندر بھان نے ان کا تعارف بانو سے کرایا۔ ”یہ مسٹرارجن شرما ہیں اور یہ ہیں

ڈاکٹر ہی بات کر رہا تھا۔ ”جی نمسکار‘ میرا نام شانتی ہے۔ شانتی ٹھاکر۔ آپ مجھ سے پہلے واقف نہیں مگر میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں؟“

بانو سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! بعض باتیں فون پر نہیں کی جاسکتیں.....“ ڈاکٹر چندر بھان نے شام سات بجے کا وقت دے دیا۔

اپنے ڈرائیور راماسوامی کے ہمراہ وہ وقت مقررہ سے چند منٹ قبل ڈاکٹر چندر بھان کی رہائش گاہ سول لائنز پہنچ گئی۔ شوہرا اسے ڈاکٹر کے حدود درابعہ سے آگاہ کر چکی تھی۔ ڈاکٹر چندر بھان ایم بی بی ایس تھا۔ اس کا باپ سورج بھان چودھری عرصہ دراز تک راجستھان کی صوبائی کابینہ میں شامل رہا تھا۔ چندر بھان نے بھی میڈلین میں ڈگری لینے کے بعد سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور چند ہی برسوں میں راجستھان کی پوتھ کا گورنر آئی کی صوبائی شلخ کی صدارت پر فائز ہو گیا۔

بانو گاڑی سے نیچے اتری تو سامنے ڈاکٹر کا سیکرٹری نور سنگھ اس کے سواگت کے لیے موجود تھا جس نے اپنی رہنمائی میں اسے ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر بھی آن پہنچا۔ ”مس شانتی ٹھاکر! آپ کس سلسلے میں مجھے ملنا چاہتی تھیں؟“

بانو نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! پلیرا کچھ دھیرج سے کام لیں۔ آپ کے کبھی سوالوں کا جواب مل جائے گا۔“ چندر بھان کسی قدر روکھے لہجے میں بولا۔ ”شانتی دیوی! میں خاصا مصروف آدمی ہوں مجھے امید ہے آپ تمہید میں وقت ضائع نہیں کریں گی۔“ بانو کی آواز بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے مدعا بیان کرنا شروع کیا۔ ”میرا تعلق ایک عرصے سے پوتر پالی گروہ سے ہے اور اس کی کبھی خویوں اور غایوں سے آگاہ ہوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ اور کرمل بھوانی سنگھ جی گروہ کی موجودہ قیادت سے خوش نہیں خود میں بھی گروہ کے قائدین سے ناراض ہوں۔ اس رشتے سے ہمارے درمیان دوستی کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔“

فن اردو ڈاٹ کام

راجیو! انہیں تو شاید آپ جانتی ہوں کیونکہ یہ بھی آپ کی طرح پوترپانی گروہ کے پرانے کارکن رہے ہیں۔ آج کل ان سے کچھ باغی سے ہو رہے ہیں۔ ”بانو نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر انہیں پرہیز کیا اور اپنی کسی حرکت سے چند رہبان کو شبہ نہ ہونے دیا کہ وہ لوگ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

کچھ دیر بعد چند رہبان اور نور سنگھ کھانے کا انتظام کرنے اندر چلے گئے تو ان تینوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ بانو نے مختصر الفاظ میں پوری چٹانادی اور آشا اور سیوا رام کی حالت زار کا ذکر بھی کر ڈالا۔ راجیو اور مراد کو دلی صدمہ ہوا۔ تب ملازم نے انہیں ڈانگ ہال میں آنے کی درخواست کی۔ وہ تینوں اسی ملازم کی رہنمائی میں کھانے کی میز تک پہنچے جہاں چند رہبان ان کا منتظر تھا۔

کھانے کے دوران ہی ڈاکٹر کو کرل بھوانی سنگھ کا پیغام آیا کہ وہ راجیو کو ساتھ لے کر فوراً اس کے ہاں پہنچے۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہوتے ہی روانہ ہو گئے جانے سے پہلے ڈاکٹر نے مراد اور بانو کو تاکید کی کہ وہ اس کی واپسی تک یہیں ٹھہریں۔ وہ دونوں دل سے یہی چاہتے تھے۔ دونوں ڈانگ روم میں بیٹھ کر پوری تفصیل سے اپنی اپنی کارگزاری ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

مراد نے بانو کو اس گروہ کی اصلیت سے آگاہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ اگر یہ دستاویزی ثبوت مل جائے کہ یہ گروہ بھارتی سرکار کا ذیلی ادارہ ہے اور اس کی تشکیل کا مقصد پاکستان میں دہشت گردی پھیلانا ہے، تو یہ بات پاکستان کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اترتے ہوئے بانو بولی۔ ”مراد! ہمیں اس بکھیرے میں نہیں پڑنا چاہئے میری دانست میں ہر عمل جتنا بمقصد نظر آتا ہے، درحقیقت وہ اتنا ہی لالچنی ہوتا ہے۔ ہر عمل سے میرا یقین اٹھ سا گیا ہے۔ لگتا ہے میں اندر سے مریجی ہوں۔

”مراد! اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ اپنے بھائی کی موت کا جلد سے جلد انتقام لے لوں۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اپنے بے گناہ بھائی کی قبر پر اس وقت تک نہیں جاؤں

گی جب تک اس کا قاتل میرے ساتھ نہیں ہوگا اور بھائی کی قبر کے سرہانے کھڑی ہو کر میں اس کے قاتل سے انتقام لوں گی۔“

مراد کو اس کی یہ خواہش بڑی عجیب سی لگی۔ ”بانو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیسے تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جناب مراد صاحب! عقلمندوں کی اس بھیڑ میں زندہ رہنے کے لئے تھوڑا سا پاگل پن ضروری ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ میں تریپانھی کو ظفر کی قبر پر کیسے لے جاسکتی ہوں۔“

مراد نے قدرے سوچتے ہوئے کہا۔ ”بانو! تمہیں تریپانھی کا مکمل اعتماد حاصل کرنا ہوگا اور یہ سبھی ممکن ہوگا جب اس کے لئے تم کوئی شاندار کارنامہ انجام دے چکی ہو۔“ واپس پہنچ کر بانو نے شوبھا کے ذریعے پانی گروہ کے ہیڈ کوارٹر کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس انتہائی اہم اور حساس معلومات ہیں، جنہیں وہ گروہ کے سربراہ تریپانھی تک پہنچانا چاہتی ہے۔

چند روز کی سوچ دھار کے بعد تریپانھی نے بانو سے ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ دونوں کے درمیان یہ ملاقات ہیڈ کوارٹر میں ہوئی اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔

اپنے بھائی ظفر اقبال کے قاتل کو سامنے پا کر بانو کی آنکھوں میں خون اتر آیا، لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ تریپانھی کی آواز میں دنیا جہاں کی شفقت سمٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جو بانو کو متاثر کرنے لگی تھی۔ اپنے آپ کو بڑی جوان ہمتی سے سنبھالا دیا اور بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”تریپانھی جی! مجھے راجیو اور ڈاکٹر بھان کی زبانی علم ہوا ہے کہ آپ کے قتل کی باقاعدہ سازش تیار کر لی گئی ہے اور اس میں گروہ کے چند سینئر ارکان بھی ملوث ہیں۔“

تریپانھی نے اس کی بات سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ ”اڑکی! تو میرا وقت ضائع کر رہی ہے۔ اگر تو نے دوبارہ ایسی کمائی گھڑنے کی کوشش کی تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ بانو اس کی ڈانٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”مہاراج! میرا فرض آپ کو

جے پور کے پو ترپالنی ☆ 136

خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کو پارسل کے ذریعے ایسا دھماکہ خیز مواد بھیجا جائے گا جو آپ کے لئے جان لیوا ثابت ہوگا۔

ترپانھی کو اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہ آیا، مگر اس نے شانتی کے پر خلوص جذبات کے پیش نظر کوئی سخت بات نہیں کی اور یوں یہ ملاقات محض دس منٹ جاری رہ کر ختم ہو گئی۔ اس ملاقات کے ایک ہفتے بعد گیتا جی روزمرہ آنے والی ڈاک دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران ان کی نظر ایک چھوٹے سے پارسل گفت پر پڑی جس پر نمایاں حروف میں تحریر تھا۔ ”صرف دیوی پر شاد ترپانھی کے لئے۔“

گیتا جی نے اس پارسل کی بابت فوری طور پر ترپانھی کو مطلع کیا۔ جواب آیا پارسل کھول کر انہیں بھجوا دیا جائے۔ گیتا جی نے پارسل کھولنا شروع کر دیا۔ ناگہ ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ پارسل میں لپٹا ہوا بم اتنا طاقتور تھا کہ اس نے گیتا کے جسم کو چشم زدن میں لو تھڑوں کا ایک ڈھیر بنا دیا۔ آفس کی چھت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی۔

پورے جے پور میں اس ہولناک سانحے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ترپانھی نے چند گھنٹوں بعد خود بانو کی رہائش گاہ پر جا کر اس کا شکویہ ادا کیا کہ تمہاری وجہ سے میری جان بچ گئی ہے۔ بانو کے علاوہ صرف مراد اور راجیو جانتے تھے کہ اس پارسل کو بھجوانے والا کون ہے۔ بانو کو شو بھا کی زبانی پتہ چلا کہ اس دھماکے کے فوراً بعد ترپانھی نے آشا اور سیوارام کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بانو نے یہ خبر راجیو سے پوشیدہ رکھی۔

اس واقعے کے بعد ترپانھی بانو پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا اور اسے گردہ میں غیر اعلانیہ طور پر ترپانھی کے نمبر نو کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ گردہ کے سینئر ارکان بانو کی اس قدر حوصلہ افزائی پر بہت ناخوش تھے، مگر تنقید کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔ دوسری جانب جوں جوں انکیشن کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی، دونوں فریقوں میں تلخی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ جے پور کا سیاسی ماحول انتہائی کشیدہ ہو چکا تھا۔

مہاراج اور راجیو کے روابط کا گھرس آئی کے مقامی لیڈروں سے روز بروز بہتر ہوتے

جے پور کے پو ترپالنی ☆ 137

جارے تھے اور اب انہیں بانو سے ملنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ آخر کار مراد اور راجیو نے آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ راجیو، آشا کی الناک موت سے آگاہ ہونے کے بعد ترپانھی کی مخالفت میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا، چنانچہ ان تینوں نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ء کو بانو نے فون پر ترپانھی سے ملاقات کا وقت مانگا جو اسے فوری طور پر مل گیا۔ ترپانھی نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی کوٹھی میں کسی قسم کی چل چل یا شور و غل کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ نوکر کے ہمراہ رہتا اور اپنے ذرا تنگ روم کو اسٹڈی روم کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

ترپانھی نے بڑی خوشدلی سے شانتی کا استقبال کیا۔ لگتا تھا وہ ابھی پوجا پاٹھ سے فارغ ہوا ہے۔ اپنے ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر وہ بانو کی جانب متوجہ ہوا۔ ”آؤ شانتی آؤ! آج تو تم بڑی نکھری نکھری سی لگ رہی ہو۔“ بانو اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ ”ہاں ترپانھی جی! آج میں واقعی خود کو بھی نکھری سی لگ رہی ہوں۔ ویسے شاید نکھرنے اور نکھرنے کا بھی آپس میں کوئی گہرا تعلق ہے؟“

ترپانھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”شانتی! کبھی کبھی تم خاصی گہری باتیں کرنے لگتی ہو۔ ویسے بالی دے دے تم کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟“ بانو شکفتہ انداز میں مسکرائی۔ ”ترپانھی جی! چھوڑیں پڑھائی کی باتیں، ویسے ایک بات یاد رکھیں۔ دانش یا حماقت کسی ڈگری کی محتاج نہیں۔ میں بہت سادہ دل ہوں اگر تھوڑی سی مزید سادہ ہوتی تو یقیناً بیوقوف کہلاتی۔“ ترپانھی اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ شانتی! دشواریاں اگر کہیں تم دس میں سال پہلے مل جاتیں تو یقیناً تم سے شادی کر لیتا۔ ویسے اس آئینہ پار آج بھی غور کیا جاسکتا ہے۔“

بانو شرمیلے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ”اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال تو میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔“ ترپانھی بھی پوری طرح سنجیدہ ہو گیا۔

ون اردو ڈاٹ کام

”ہاں کو کیا بات ہے؟“ بانو مستحکم لہجے میں بولی۔ ”مجھے پتہ چلا ہے کہ کرنل بھوانی سنگھ اور راجیو آپ کے خلاف کوئی نئی سازش تیار کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں ان کا الور آنا جانا رہتا ہے۔“ ترپانھی نے پوچھا۔ ”الور جانے سے ان کا کیا مقصد؟“ بانو بولی۔ ”مجھے یہ تو علم نہیں مگر ان کی بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پراسرار سرگرمیوں کا تعلق الور کے نواح میں واقع کالی ماتا کے مندر سے ہے جہاں وہ دونوں تقریباً ہر دوسرے روز جاتے ہیں۔“

ترپانھی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”بڑی عجیب سی بات ہے۔ میں الور کئی سال رہ چکا ہوں۔ وہاں ایسی کوئی پوشیدہ جگہ نہیں کالی ماتا کے مندر میں جا کر دیکھنا ہو گا کہ ان لوگوں نے وہاں کون سا کھیل شروع کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں وہاں کل ہی جاتا ہوں۔“

شانتی بولی۔ ”نہیں‘ میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی بلکہ خود بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ ترپانھی اس کے خلوص سے متاثر ہوتے ہوئے بولا۔ ”ارے بھئی! تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ میں وہاں اکیلا جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ میرے تین چار باڈی گارڈز ہوں گے۔“ شانتی اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”لغت بھیجیں ان باڈی گارڈز پر۔ جب کوئی مصیبت آن پڑے تو دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ میں خود آپ کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔“

ترپانھی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم چلو گی تو اور بھی اچھا ہو گا تب ان لوگوں کو ساتھ لے جانا ویسے بھی مناسب نہیں رہے گا۔“ شانتی بولی۔ ”تو پھر ہم کل کس وقت یہاں سے ردا زنہ ہوں گے؟“ ترپانھی کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”یہاں سے کل سہ پہر تین بجے چلیں گے اور شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ رات وہیں بسر کر کے پرسوں لوٹ آئیں گے۔“ بانو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

۱۶ دسمبر کی سہ پہر وہ دونوں ترپانھی کی مرشدیز گاڑی میں الور کے لیے روانہ ہوئے۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا اور سردی میں خاصی شدت آچکی تھی۔ الور پہنچنے تک سائے ڈھل گئے تھے اور شام کی آمد آمد تھی۔ شہر کو بائیں جانب پھوڑتے ہوئے وہ کالی ماتا کے مندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ترپانھی نے گاڑی کے اندر ہی خاصی مقدار میں شراب کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور سارے راستے وقفے وقفے سے اسے اپنے معدے میں اغذیل چکا تھا، مگر اس کے حواس پوری طرح قائم تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرانا پیئے والا ہے۔ الور کی سرسبز پہاڑیوں کے دامن سے گزرتے ہوئے اس نے شاعری کرنے کی کوشش کی۔ ”شانتی ڈیر! بھگوان کرے ہمارا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو!“

بانو کی آواز میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ ”ترپانھی جی! کسی کا بھی سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہر شخص ہر دم سفر میں ہوتا ہے۔ کبھی باضی کی طرف اور کبھی آنے والے زمانوں کی جانب۔ اب پتہ نہیں ہمارا یہ سفر ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟“ ترپانھی اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”جے پور میں آج تک مجھے کم ہی ایسی عورتیں نظر آئی ہیں جنہیں خوبصورت کہا جاسکے۔ اجڑی ہوئی شکلیں، سازھی کی گرفت سے نکتے ہوئے بے ڈھنگے پینٹ۔ ایسے حالات میں تم جیسی سندر ناری کا ساتھ غنیمت ہی نہیں، مال غنیمت ہے۔“

اس کی بیسودہ گوئی سن کر بانو کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”ابھی کالی ماتا کا مندر کتنی دور ہے؟“ ترپانھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ دور نہیں۔ آگے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا ایک پرانا قبرستان ہے اسی سے ملحقہ یہ مندر ہے۔“ بانو دھیرے سے بڑبڑائی۔ ”تو کیا بھارت میں ابھی تک مسلمانوں کے قبرستان موجود ہیں؟“ ترپانھی کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔ ”شانتی جی! بھارت دیش میں اب مسلمانوں کی قبریں ہی زندہ رہ گئی ہیں۔ باقی مسلمان تو زندہ لاشیں ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو یہ قبریں بھی مٹادی جائیں گی۔“

ابھی بانو اس کی بات پر غور کر رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھا۔ ”وہ سائے قبرستان آگیا۔ بانو کی تمام حیات اچانک بیدار ہو گئیں۔ وہ تقریباً چلا اٹھی۔ ”ترپانھی جی! بیس گاڑی روک لیں۔ میں ذرا دیکھنا چاہتی ہوں کہ قبرستان کیسے ہوتے ہیں۔“ ترپانھی نے اس کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر اس نے گاڑی ایک جانب کچے میں اتار کر روک لی۔ بانو نے میکا کی انداز میں دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ قبرستان بہت وسیع رتبے پر پھیلا ہوا تھا۔ در در دور تک ٹوٹی اور دیران قبروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وسعت اور دیرانی لازم و ملزوم ہیں۔ وہ ایک جانب کھڑی ہو کر جانے کن خیالوں میں کھو گئی۔ بانو کو یوں لگا جیسے وہ ہمیشہ سے بیس رہتی ہے اور اس کا اکلوتا ماں جایا بیس کسی قبر میں ہمیشہ کے لیے سو رہا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک قبر کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے سادان بھادوں کی جھری لگی تھی۔

تھوڑا آگے بڑھی تو ایک مزار نما قبر دکھائی دی۔ لمبھٹ ٹوٹی ہوئی مسجد مزار سے زیادہ اجڑی ہوئی تھی۔ شکستہ دیوار پر بیٹھا تیار پرندہ اسے مزار کا متون معلوم ہوا۔ اسی اثنا میں ایک گنوار سا ہندو آیا۔ دھوتی، چٹیا والے اس ہندو نے مزار کے سامنے مودب ہو کر نمسکار کیا۔ ہاتھ جوڑ قبر کو بوسہ دیا، دعا مانگی اور چلتا ہوا۔ بانو اس کی دعا نہیں سن سکی، مگر بے اختیار اس کے منہ سے آمین نکل گئی۔

ترپانھی کار کے پاس کھڑا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور بانو کے کندھے کو زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔ ”شانی! یہ کیا پاگل پن ہے! چلو گاڑی میں بیٹھو شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔“ بانو شاید اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ترپانھی کے پاؤں پکڑتے ہوئے بولی۔ ”ترپانھی جی! تین سال پہلے آپ نے الور جیل میں جن دو پاکستانیوں کو جان سے مارا تھا، ان کی قبریں کہاں ہیں؟ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے ان کا پتہ بتادیں تاکہ میں وہاں فاتحہ پڑھ سکوں۔ اپنے بھائی کو جاسکوں کہ بوڑھی ماں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ ظفر اقبال کو کہنا کہ اپنی

چھوٹی بہنوں کا خیال رکھے، مگر وہ ہمیں تنہا چھوڑ کر اس شیر خوشاں میں آہٹا۔“ ترپانھی بری طرح چونکا۔ عشق کا بھوت اس کے سر سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے بہت بڑے فخر سے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے بانو کو دھکے سے پرے پھینکا اور اپنی گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا ہو گا کہ برگد کے بڑے سے بڑے کوئی چیز دھب سے اس پر آن پڑی۔ خوف کے مارے اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ اس نے اپنے اوپر گرنے والی چیز سے جان چھڑانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ چند لمحوں بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی شخص رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا ہے۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ معمولی سی بھی مزاحمت نہ کر سکا۔

مراد اور راجیو نے ترپانھی کو باندھنے کے بعد بانو کو اٹھایا جو ایک قبر پر آدھ سے منہ پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے حواس میں آگئی۔ مراد، ترپانھی کے سامنے پہنچا اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے بولا۔ ”ترپانھی جی! آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں، تین سال پہلے الور جیل میں آپ نے بے بس پاکستانیوں پر جو ظلم کیا تھا، آج اسی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔“ وہ دونوں اسے ہانڈوں اور ٹانگوں سے اٹھا کر ایک جانب چل پڑے۔ وہ ہڈیانی انداز میں چلا رہا تھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔“ کوئی جواب دیے بغیر وہ آگے بڑھتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بانو بھی آ رہی تھی۔

خاصی دور جا کر انہوں نے ترپانھی کو ایک تازہ کھدی قبر کے قریب پنگ دیا۔ ترپانھی پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھا اور اسے آنے والے لمحات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا، مراد کا لہجہ حد درجہ کھردرا تھا۔ ”مسٹر ترپانھی! ردنا دھونا فضول ہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۶ء کو تم نے جس کھیل کا آغاز الور جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کیا تھا، آج اس کا زراپ سین تھیں اس قبر میں زندہ دفنانے کے ساتھ ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اسے قبر کے گڑھے میں پھینک دیا۔ رات کی تاریکی ہر شے کو اپنے اندر سمیٹ چکی تھی۔ ترپانھی کی آخری چہنیں اس قدر ہولناک تھیں کہ چند لمحوں کے

جے پور کے پوترپلپی ☆ 142

لیے مراد بھی اداس ہو گیا، البتہ بانو کے چہرے پر ملال کے آثار بالکل نہیں تھے۔ اوپر سے
مٹی برابر کرنے کے بعد وہ تریپانھی کی کار میں بیٹھ کر دہلی کی جانب روانہ ہو گئے۔
☆=====ختم شد=====☆

فن اردو ڈاٹ کام